حصہ اوّل

آیت اللہ سید جعفر مرتضیٰ عاملی مدظلہ العالی

احسن الجوابات

(حصہ اوّل)

از قلم

آیت اللہ جعفر مرتضیٰ عاملی، لبنان

مترجم

حجۃ الاسلام علامہ محمد حسن جعفری

پیش کش

حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری فاضل قم

ناشر

ادارہ منہاج الصالحین

جناح ٹاؤن، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور

فون: 35425372

کتاب	:	احسن الجوابات (حصہ اول)
از قلم	:	آیت اللہ جعفر مرتضیٰ عاملی، لبنان
مترجم	:	حجۃ الاسلام علامہ محمد حسن جعفری
نظر ثانی	:	حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری فاضل قم
پروف ریڈنگ	:	ملک ابرار حسین میثم حیدری - فخر عباس حیدری
اشاعت	:	ستمبر 2010ء
صفحات	:	248
ہدیہ	:	روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ منہاج الصالحین ۔ لاہور

الحمد مارکیٹ فسٹ فلور دکان نمبر 20 - غزنی سٹریٹ - اُردو بازار - لاہور

فون: 37225252-042 ، 0301-4575120

بسم الله الرحمن الرحيم

ترتیب

سوال تمہارے جواب ہمارے

پروردگار عالم کا کچھ لوگوں پر خصوصی لطف و کرم ہوتا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے ایسے امور سرانجام دیتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں اور انسان ان کے چھوڑے ہوئے نقوش سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ قابلِ داد و تحسین ہوتے ہیں کہ جو اپنا آرام و سکون تج کر کے مکتب کی آبیاری کے لیے شبانہ روز کام کرتے ہیں۔ اپنے منتخب کردہ مشن میں آنے والی ہر مشکل کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں اور اپنے مشن کی طرف آگے بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ موسم کی تبدیلی سردی و گرمی اور شدائد و مصائب ان پر اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ وہ یک سوئی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتے ہیں۔

تاریخ تشیع ایسے علمائے ربانی سے بھری پڑی ہے جنھوں نے ناپید حالات میں، مصائب و آلام میں گھر کر اور مشکلات جھیل کر مکتب امام صادقؑ کی نشر و اشاعت کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، بلکہ پوری توانائی اور قوت کے ساتھ اپنے مشن کی طرف رواں دواں رہے۔ علامہ حلیؒ، علامہ مجلسیؒ، سید مرتضیٰؒ وغیرہ کے نام روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ انھوں نے پوری دلجمعی کے ساتھ اَن تھک محنت کی اور صدائے مکتب کو پوری دنیا تک پہنچایا بلکہ ان میں سے اکثر علمائے اعلام وہ ہیں کہ جن کی زندگی میں اُن کے آثار خالدہ منصۂ شہود پر نہیں آئے بلکہ مرنے کے بعد زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوئے لیکن پھر وہ تحریریں ایسی جاندار ثابت ہوئیں کہ ان کا تعلق کسی خاص زبان، علاقہ اور زمان و مکان سے نہیں رہا بلکہ انھوں نے عالمی اور ابدی شہرت حاصل

کی، جیسے بحارالانوار مفاتیح الجنان وغیرہ۔

ان علمائے کرام میں خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ کسی لالچ کے تابع ہو کر یہ نظریاتی و فکری کام نہیں کرتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے محمدؐ و آلِ محمدؐ کی خوشنودی کی خاطر اور کتب کی حقانیت کے لیے کمر بستہ رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی سعیٔ جمیلہ کو پذیرائی بخشی ہے کہ وہ رہتی دنیا تک زندہ و جاوید ہو گئے ہیں۔

ہمارے ان تابندہ و درخشندہ علمائے عصر میں آیت اللہ سید مرتضیٰ جعفر عاملی لائقِ صد تحسین ہیں کہ جنھوں نے بڑی ہی جانفشانی اور عرق ریزی سے تحقیقی و علمی اور فکری و نظریاتی کام کیا۔ آپ نے حضور سرورِ کائنات کی ذات والاصفات پر چونتیس جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب مرقوم کی جس نے علمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ شیعہ تو کجا اہلِ سنت حلقوں میں اس کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس کے بعد آپ نے سیرت امیر المومنینؑ پر چونتیس جلدوں پر مشتمل ایک طولانی اور فکری کتاب مرتب کی۔ جس کی توصیف و تمجید کے بغیر کوئی منصف مزاج آدمی رہ نہیں سکتا۔ ان کتابوں کا چرچہ چار سُو پھیل ہی رہا تھا اور ہر طرف آپ کی تحسین و توصیف کے ڈونگرے بج ہی رہے تھے کہ علم دوست لوگوں کا رجحان آپ کی طرف ہو گیا۔ اکناف و اطراف میں آپ سے سوال پوچھے جا رہے تھے۔ انھوں نے اپنی معلومات کے استفادہ کے لیے اور اغیار نے بھی اپنی روش کے ہاتھوں مجبور و مقہور ہو کر تابڑ توڑ حملے کیے۔ آپ نے ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور ان کا بھرپور علمی و تحقیقی جواب دیا۔ ان سوالات و جوابات کو ترتیب دیا گیا اور ہنوز چودہ جلدیں "مختصر مفید" کے عنوان سے آراستہ و پیراستہ ہو چکی ہیں۔ یہ سوالات و جوابات ہر عنوان سے مربوط ہیں۔ کسی خاص موضوع پر نہیں ہیں۔

انٹرنیٹ پر جب ہمیں اس کی اطلاع موصول ہوئی تو ہم نے فوراً اپنے دوستوں، علامہ الطاف حسین کلاچی اور علامہ محمد حسن جعفری صاحب سے ترجمہ کے لیے مشاورت کی تو انھوں نے فوراً ترجمہ کی حامی بھر لی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان احباب کی عمر دراز فرمائے اور ان کی اس سعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے۔

ہم نے اس کتاب کا نام "احسن الجوابات" سے موسوم کیا ہے۔ امید واثق ہے کہ مومنین کرام اس سے بھرپور استفادہ کریں گے اور اس کو پذیرائی بخشیں گے۔ مؤلف ومترجمین کو اس کا اجر نصیب ہو اور ہماری توفیقِ خیر میں اضافہ بحق محمدؐ و آلِ محمد ہو۔ پروردگار بحق بیمارِ کربلا ہمیں بیماریوں سے نجات دے۔

والسلام مع الاکرام

مکتب صادقؑ کا ادنیٰ خدمت گزار

ریاض حسین جعفری فاضل قم

سربراہ ادارہ منہاج الصالحین، لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

کچھ اپنی زباں میں

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ (الزمر:۹)

"آپ کہہ دیں کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو صرف عقل والے ہی قبول کرتے ہیں"۔

قرآن کریم نے بہت سے اضداد کی عدمِ یکسانیت کا ذکر کیا ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

① هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ○ (الرعد:۱۶)

"آپ کہہ دیں کہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتے ہیں اور کیا تاریکیاں اور روشنی برابر ہیں؟"

② وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ...... (حم السجدہ:۳۴)

"نیکی اور برائی یکساں نہیں ہیں"۔

③ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوٗنَ (السجدہ:۱۸)

"کیا مومن اور فاسق برابر ہو سکتے ہیں؟"

④ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ (المائدہ:۱۰۰)

"آپ کہہ دیں کہ پاک اور ناپاک برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک لوگوں کی کثرت آپ کو بھلی ہی کیوں نہ لگے"۔

⑤ وَ مَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ ...... (فاطر:۲۲)

ترجمہ:

⑥ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ...... (الحشر:۲۰)

"دوزخ جانے والے اور جنت جانے والے برابر نہیں ہیں"۔

قرآن کریم میں اس مضمون کی اور آیات بھی موجود ہیں لیکن ہم سردست اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان آیات کے باہمی موازنہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جس سے اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں اور جس طرح سے ظلمات و نور برابر نہیں اور جس طرح سے نیکی اور بدی برابر نہیں ہے اور جس طرح سے مومن اور فاسق برابر نہیں اور جس طرح سے پاک اور ناپاک برابر نہیں اور جس طرح سے زندہ اور مُردہ برابر نہیں۔ جس طرح سے جنتی اور دوزخی برابر نہیں ہیں۔ اسی طرح عالم اور جاہل بھی برابر نہیں ہے۔

صاحب علم بینا ہے اور جاہل اندھا ہے۔ علم نور ہے اور جہالت تاریکی ہے، علم نیکی ہے اور جہالت سراپا برائی ہے۔ علم ایمان ہے اور جہالت فسق ہے۔ عالم طیب ہے اور جاہل خبیث ہے۔ عالم زندہ ہے اور جاہل مُردہ ہے۔ عالم جنتی ہے اور جاہل دوزخی ہے۔

علم سے مشکلات آسان ہوتی ہیں۔ علم سے کرامت کا ظہور ہوتا ہے اور صاحب علم میراث انبیاءؑ کا وارث ہوتا ہے اور جاہل فرعون و شداد و ابوجہل کی

میراث کا وارث ہوتا ہے۔

علم کی قوت کیا ہے؟ جس کے پاس علم کتاب کا تھوڑا سا حصہ تھا اس نے تختِ بلقیس کو ملکِ سبا سے چشم زدن میں اُٹھا کر سلیمان کے سامنے رکھ دیا تھا اور جسے اللہ نے ومن عندہ علم الکتاب کہا۔ اس کے اشارہ سے سورج پلٹ آیا۔

فیضانِ علم کیا ہے؟ کتاب تحف العقول کے صفحہ ۱۶ پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث منقول ہے جس میں آپ نے فیضانِ علم کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

واما العلم فیستتعب منه الغنی وان کان فقیرا والجود وان کان بخیلا والمهابة وان کان هینا والسلامة وان کان سقیما والقرب وان کان قصیا والحیاء وان کان سلفا والرفعة وان کان وضیعا والشرف وان کان رذلا والحکمة والحظوة فهذا ما یتتعب للعاقل بعلمه فطوبٰی لمن عقل وعلم

"علم سے غنا پھوٹتا ہے اگرچہ وہ فقیر ہو۔ سخاوت جنم لیتی ہے اگرچہ وہ ذاتی طور پر بخیل ہو اور رعب پیدا ہوتا ہے اگرچہ وہ بے وقار ہو۔ سلامتی نصیب ہوتی ہے اگرچہ وہ بیمار ہو۔ قرب ملتا ہے اگرچہ وہ دُور ہو، حیا ملتا ہے اگرچہ منہ پھٹ ہو، بلندی ملتی ہے اگرچہ وہ پست ہو، شرف ملتا ہے اگرچہ وہ رذیل ہو اور حکمت و مقدر ملتا ہے"۔

یہ وہ خصائص ہیں جنھیں ایک عقل مند اپنے علم کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہے، خوش خبری ہے اس کے لیے جو صاحب عقل اور صاحب علم ہو۔

حضرت رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

تعلموا العلم فان تعلمه حسنة ومدارسته تسبيح والبحث عنه جهاد وتعليمه لمن يعلمه صدقة وبذله لاهله قربة لانه معالم الحلال والحرام وسالك بطالبه سبل الجنة ومونس فی الوحدة وصاحب فی الغربة ودليل على السرّآء وسلاح على الاعداء وزين الاخلاء يرفع الله به اقواما يجعلهم فی الخير ائمة يقتدیٰ بهم ترمق اعمالهم وتقتبس آثارهم وترغب الملائكة فی خلتهم لان العلم حياة القلوب ونور الابصار من العمیٰ وقوة الابدان من الضعف وينزل الله حامله منازل الاحباء ويمنحه مجالسة الابرار فی الدنيا والآخرة، بالعلم يطاع الله ويعبد وبالعلم يعرف الله ويوحد وبه توصل الارحام ويعرف الحلال والحرام والعلم امام العقل (تحف العقول/۲۸)

"علم حاصل کرو اس کا پڑھنا نیکی ہے۔ اس کا دہرانا تسبیح ہے۔ اس کی جستجو جہاد ہے اور نہ جاننے والے کو علم پڑھانا خیرات ہے اور اہل افراد کو علم سے آشنائی دینا قرب خداوندی کا ذریعہ ہے کیونکہ علم ہی حلال و حرام کا سنگ میل ہے اور اپنے طالب کو جنت کی راہوں پر گامزن کرتا ہے۔ علم تنہائی میں مونس ہے اور مسافرت میں رفیق سفر ہے۔ خوش حالی کے راستے دکھاتا ہے،

دشمنوں کے خلاف ہتھیار ہے اور دوستوں کے لیے زینت ہے،
اللہ علم کی وجہ سے اقوام کو ایسی بلندی عطا کرتا ہے کہ وہ نیکیوں
میں لوگوں کے رہنما قرار پاتے ہیں۔ لوگ ان کی پیروی کرتے
ہیں اور لوگ ان کے کردار کو اپنے لیے نمونہ سمجھتے ہیں اور ان کے
آثار کی جستجو کرتے ہیں اور ملائکہ ان کی دوستی کی رغبت کرتے ہیں
کیونکہ علم دلوں کے لیے زندگی ہے اور اندھے پن سے بچنے کے
لیے آنکھوں کا نور ہے اور ضعف و کمزوری سے بچنے کے لیے علم
اجسام کی قوت ہے۔ اللہ عالم کو اپنے پیاروں کی منازل میں جگہ
دے گا اور دنیا و آخرت میں اسے نیک افراد کی صحبت عطا کرے گا۔
علم کی بدولت اللہ کی اطاعت و عبادت کی جاتی ہے۔ علم کی
بدولت خدا کی پہچان ہوتی ہے اور اس کی توحید کا نظریہ ملتا ہے۔
علم کی بدولت صلہ رحمی ہوتی ہے اور علم کے ذریعہ سے حلال و
حرام کی پہچان ہوتی ہے اور علم عقل کا رہنما ہے"۔

حضرت علی علیہ السلام نے اہلِ بیتؑ کے کردار کو ان الفاظ میں بیان کیا:

هم عيش العلم وموت الجهل يخبركم حلمهم عن
علمهم وظاهرهم عن باطنهم وصمتهم عن حكم
منطقهم...... عقلوا الدين عقل وعاية ورعاية لاعقل
سماع و رواية فان رواة العلم كثير ورعاته قليل

"وہ علم کے لیے باعثِ حیات اور جہالت کے لیے سبب مرگ
ہیں۔ ان کا حلم ان کے علم کا اور ان کا ظاہر ان کے باطن کا اور
ان کی خاموشی ان کے کلام کی حکمتوں کا پتہ دیتی ہے۔ انھوں نے

دین کو سمجھ کر اور اس پر عمل کر کے اسے پہچانا ہے نہ کہ صرف نقل وسماعت سے اسے جانا ہے۔ یوں تو علم کے راوی بہت ہیں مگر اس پر عمل پیرا ہو کر اس کی نگہداشت کرنے والے کم ہیں"۔
(نہج البلاغہ، خطبہ ۲۳۶)

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کے لیے علوم کے ایک ہزار دروازے کھولے تھے پھر ہر دروازے سے ایک ہزار دروزے وا ہوئے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام نے پوری زندگی علمِ نبوت کو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور آپ کے مکتب فیض سے سلمان، ابوذر، مقداد، عمار، ابن عباس، رشید ہجری، میثم تمار جیسے نابغۂ روزگار وجود میں آئے۔

پھر مکتبِ امامت سے تشنگانِ علم کی پیاس بجھتی رہی اور جب امام جعفر صادق علیہ السلام کا دور آیا تو ہر طرف علوم آلِ محمدؐ کی روشنی پھیل گئی۔ آپ کے بعد ہر امام نے رُشد وہدایت کے پیغام کو عام کیا۔ یہاں تک کہ ایامِ غیبت قریب آگئے اور مکتبِ تشیع علمی لحاظ سے کامل واکمل ہو گیا۔

معصومینؑ نے اپنے پیروکاروں کو ملت کے علماء کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا۔ پھر غیبت کبریٰ کے عرصہ میں علمائے حق نے اپنی ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ سرانجام دیا اور انھوں نے راستے کی رکاوٹوں کی کبھی پرواہ نہ کی۔ راہِ حق میں انھیں شہید ہونا، ان کے گھروں کو نذرِ آتش کیا گیا اور قدم قدم پر انھیں نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے کمال صبر سے پیغامِ دین کی تبلیغ کی۔

ایسے ہی آسمان قامت علماء میں آیت اللہ العظمیٰ جناب جعفر مرتضیٰ عاملی لبنان بھی شامل ہیں۔

آپ کی پوری زندگی مذہب اہلِ بیتؑ کی ترویج میں بسر ہوئی۔ بعض اوقات

آپ کو کچھ حاسدوں کے حسد کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن آپ نے حق پر آنچ نہ آنے دی۔ آپ کی تالیفات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں مأساة الزهرا، خلفيات مأساة الزهرا، بنات النبي، أم رباابه کو بڑی شہرت نصیب ہوئی۔

مختلف مقامات سے لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں اور آپ ان کا جواب دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے جوابات کی کتاب اس وقت چودہ حصوں میں اسئلة واجوبة مختصرة ومفيدة کی شکل میں موجود ہے۔

آپ کی یہ کتاب انٹرنیٹ پر موجود ہے۔

خداوند عالم حجۃ الاسلام والمسلمین مروج حقائق آل محمد علامہ ریاض حسین جعفری کو جزائے خیر دے جنھوں نے چند سال قبل لاہور میں اپنا ادارہ منہاج الصالحین کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس ادارہ کو اگرچہ کسی طرف سے کوئی مدد نہیں ملتی مگر علامہ موصوف نے چند ہی برسوں میں مذہب آل محمدؐ کی اتنی کتابیں شائع کرائیں جتنے بڑے بڑے ادارے پچاس برسوں میں بھی شائع نہ کرا سکے۔ ہر وقت آپ پر یہی دھن سوار رہتی ہے کہ ملت جعفریہ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے علامہ موصوف کے جذبات کی اس طرح سے قدردانی کی کہ آج کسی بھی شیعہ بک سنٹر پر جتنی کتابیں منہاج الصالحین کی دکھائی دیں گی اتنی باقی تمام اداروں کی کتابیں دکھائی نہ دیں گی۔

آپ نے قرآن، حدیث، تفسیر، تاریخ، فقہ و احکام، مقتل اور مجالس کے عناوین پر ان گنت اور قابلِ قدر کتابیں شائع کرائیں۔ چنانچہ جب آپ نے آیت اللہ جعفر مرتضیٰ عاملی مدظلہ العالی کی سوال جواب پر مشتمل کتاب کو انٹرنیٹ میں ملاحظہ کیا تو فوراً اسے ڈاؤن لوڈ کر کے ترجمہ کے لیے میرے پاس روانہ کی۔

کتاب ہذا دراصل ان کی چودہ جلدوں میں سے پہلی دو جلدوں کی تلخیص ہے۔

میں نے جب کتاب کا مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس میں بہت سے ایسے مسائل بھی ہیں جن کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے غیر متعلقہ مسائل کو حذف کر دیا اور جو مسائل ہمارے لیے مفید تھے، میں نے ان کا آسان اُردو میں ترجمہ کر دیا۔

یہ کتاب سیریز کے انداز میں قارئین کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ اس حصّہ کو اس سیریز کی پہلی جلد سمجھئے۔ باقی مجلدات بھی وقتاً فوقتاً پیش کی جائیں گی۔

دعا ہے کہ خداوند عالم حضرت آیت اللہ العظمیٰ جعفر مرتضیٰ عاملی کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور اللہ تعالیٰ ادارہ منہاج الصالحین کی روز افزوں ترقی عطا کرے اور ادارہ کے مؤسس حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری کے جذبوں کو جوان رکھے تاکہ ملّت ان سے مستفید ہوتی رہے اور خداوند عالم مترجم حقیر کی ان مساعی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔

قارئین سے التماس ہے کہ وہ ادارہ ہٰذا کے مؤسس اور مترجم کے والدین کے لیے سورۂ فاتحہ تلاوت فرمائیں۔

بر کریمان کارہا دشوار نیست

اب میں آپ کے اور کتاب کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتا۔ اللہ تعالیٰ جملہ اہلِ اسلام پر اور بالخصوص شیعانِ آلِ محمدؐ پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے اور حضرت ولی امر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ظہور میں تعجیل فرمائے۔

ع این دعا از من و از جملہ جہان آمین باد

والسلام

راہِ حق میں آپ کا ایک ساتھی

محمد حسن جعفری

عرضِ مجیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللّٰہ محمد واٰلہ الطاھرین ، واللعنۃ علی اعدائھم اجمعین من الاوّلین والاخرین الی قیام یوم الدین

سوال انسان کے اندرونی احساس کا مظہر ہے اور اس کے ذریعے سے جہاں انسان کو ذہنی تسلی ہوتی ہے وہاں اسے جہالت کے بدلے میں علم ملتا ہے اور بے شعوری کی بجائے شعور نصیب ہوتا ہے اور حسنِ سوال نصف علم کے برابر شمار کیا جاتا ہے۔

احباب ہم سے اکثر سوالات پوچھا کرتے ہیں اور ہم اپنی حسبِ حیثیت جواب دیتے رہتے ہیں۔ ہم نے سوالات و جوابات کو مختصر رسائل کی شکل میں جمع کیا ہے تاکہ مومنین تک ان کا فائدہ پہنچے۔ ہم بھی خطا کار انسان ہیں۔ ہم سے بھی غلطی ممکن ہے۔ قارئین اور علماء سے درخواست ہے کہ وہ جہاں ہماری غلطی دیکھیں تو ہمیں اس سے مطلع فرمائیں۔ ہم بصد شکریہ اسے خوش آمدید کہیں گے۔

ہم نے کچھ سوالات کے جوابات بالکل مختصر دیے اور بعض سوالات کے تفصیلی جوابات دیے۔ یہ سب کچھ سوال کی اہمیت پر منحصر ہے۔

اللہ تعالیٰ سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں خطائے فکری اور قول و فعل کے تضاد سے محفوظ رکھے۔

والحمدللّٰہ رب العالمین ، والصلاۃ والسلام علی رسولہ محمد واٰلہ الطیبین الطاھرین عیشا الجبل (عیشا الزط سابقہ نام)

جعفر مرتضیٰ عاملی

پہلا حصہ

عقائد

سوال کیا کرہ زمین کو تباہ و برباد کرسکتا ہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو یہ قانون طبیعت پر حکمرانی تصور کیا جائے گا اور قدرتِ خداوندی کو محدود کردینے کا سبب ہوگا۔
اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے زمین کی مدتِ حیات کچھ مقرر کی لیکن انسانوں کے جھگڑے اتنے بڑھے کہ انھوں نے ایٹم بموں سے پوری زمین کو ہی ختم کردیا۔ کیا اس کے ذریعہ سے اللہ کی قدرت محدود نہ ہوجائے گی؟ کیا قیامت کا قیام اس جہان کی فنا سے مربوط ہے جسے ہم جانتے ہیں؟
اس وقت امریکہ اور سابق سوویت یونین کے یہ دعوے ہمارے سامنے ہیں کہ ہم اپنے ہتھیاروں سے کرۂ ارض کو ایک سو سے زیادہ مرتبہ تباہ و برباد کرسکتے ہیں؟

جواب انسان کو غیر معمولی قوت دینے سے اللہ کی قدرت کو محدود قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر اللہ نے ہزاروں یا لاکھوں سال کے لیے زمین کی زندگی مقرر کی ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ زمین اس کی مقرر کردہ مدت تک باقی رہے گی۔ خدا کو یہ بھی معلوم ہے کہ انسان کے ہاتھ میں تباہی کی یہ قوت آجائے گی لیکن مشیتِ الٰہی اسے بڑی تباہی سے روک دے گی۔ خدا کا علم کسی کو مجبور نہیں کرتا اور یہ علم کسی چیز کے حصول کا موجب نہیں ہوتا۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ آپ کو بھی علم ہے اور مجھے

بھی علم ہے کہ کل سورج طلوع ہوگا۔

یہ سچ ہے کہ سورج ضرور طلوع ہوگا لیکن اس کا طلوع ہونا ہمارے علم کے تقاضا پر مبنی نہیں ہے۔ قدرتِ خداوندی کی محدودیت کا سوال تب صحیح ہوتا کہ خدا زمین کی بقا کا ارادہ کرتا اور انسان اپنے ارادہ سے کرۂ ارضی کو تباہ کردیتا جب کہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔

اس کے برعکس معاملہ کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا اور انسان کو اختیار اور ارادہ کا مالک بنایا اور اسے نوامیسِ فطرت کی تسخیر کی قوت عطا کی۔ اب اس قدرت کو پانے کے بعد انسان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ خدا کی مشیت کے تحت کرتا ہے کیونکہ خدا نے اسے صاحبِ اختیار اور صاحبِ ارادہ بنا کر بھیجا ہے۔ یہاں تک کہ اسے نوامیسِ طبیعت کی تسخیر کا بھی اختیار دیا ہے۔ اب اگر خدا اس سے اپنے عطا کردہ اختیارات چھین لے تو اس سے اس کی مشیت کا ٹوٹنا لازم آتا ہے جب کہ ایسا ہونا محال ہے۔

ہمارے پاس کچھ ایسی روایات بھی موجود ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب دس میں سے نو افراد ہلاک ہوجائیں گے اور اس عظیم بربادی کے اسباب ہوں گے اور اس کا سب سے بڑا سبب انسان کا اختیار، ارادہ اور تجربہ ہے اور اس تباہی کی ذمہ داری انسانوں پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اس سے اللہ کی مشیت کے زائل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کیا رسولؐ خدا اَن پڑھ تھے؟

سوال کیا رسولؐ خدا اعلانِ نبوت سے پہلے لکھائی پڑھائی کیا کرتے تھے یا نہیں؟

جواب ہم رسولؐ خدا کو "جاہل" نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ لفظ آپؐ کے شایانِ

شان نہیں ہے، البتہ اس سوال کا جواب قرآن مجید میں یہ دیا گیا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ (عنکبوت:۴۸)

"آپؐ اس سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست شک میں پڑ جاتے"۔

اس آیت مجیدہ میں آنحضرتؐ کی نبوت اور تلاوت کتاب کے متعلق پیدا ہونے والے ہر شک وشبہ کو دُور کیا ہے۔

اگر آنحضرتؐ نے کسی انسان کے پاس سابقہ کتب کو پڑھا ہوتا یا کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہوتا تو لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ پڑھے لکھے شخص تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے اسی لیے انھوں نے قرآن نامی کتاب اپنی طرف سے بنا کر ہمارے سامنے پیش کی ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرتؐ نے کسی بھی انسان سے تعلیم حاصل نہیں کی اور اس کے باوجود آپؐ نے قرآن کی شکل میں وہ نسخۂ کیمیا پیش کیا جس کی نظیر لانے سے دنیا قاصر ہے۔ تو اس سے آپؐ کی نبوت کا اثبات ہوا۔ قرآن لانے کے بعد اس بات کی ضرورت ہی باقی نہ رہی کہ آنحضرتؐ زندگی کی آخری گھڑی تک لکھنے پڑھنے سے عاری رہ جائیں۔ کیونکہ مطلق اَن پڑھ ہونا عیب ہے اور آنحضرتؐ ہر عیب سے پاک تھے۔

اس سلسلہ کی ایک اہم بات یہ ہے کہ لکھنا پڑھنا بذاتِ خود مطلوب نہیں ہے۔ اس کا مقصد معارف تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے اور جب اللہ نے اپنے حبیب کریمؐ کو لکھنے پڑھنے کی مشقت سے دُور رکھ کر کائنات کے معارف عطا کر دیے تو اس لیے

آنحضرتؐ کے لیے "اُمّی" ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔

اللہ نے آپؐ کو ان علوم و معارف سے آگاہ کیا جن سے پڑھے لکھے افراد بھی محروم تھے تو اس سے آپ کا اعجاز ثابت ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت کو مطلقاً "اَن پڑھ" سمجھنا غلط ہے اور اس کے لیے جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ ناکافی ہیں۔

اس کے لیے پہلی دلیل کے طور پر وہی آیت پیش کی جاتی ہے جسے ہم نے ابھی نقل کیا ہے:

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ (عنکبوت: ۴۸)

اس آیت سے آپ کا اَن پڑھ اور جاہل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ یہ آیت مجیدہ دراصل یہ کہہ رہی ہے کہ آپ اس سے قبل کتاب پڑھتے تھے اور نہ ہی کچھ لکھا کرتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرستوں کو انکار نبوت کا موقع مل جاتا۔

یعنی آپؐ نے کسی انسان سے کچھ نہیں پڑھا۔ پھر اچانک آپؐ نے دنیا کے سامنے قرآن جیسی عظیم القدر کتاب پیش کر دی۔ پھر آپؐ اچانک تمام زبانوں سے واقف ہو گئے اور لکھائی پڑھائی کے رموز سے آگاہ ہو گئے۔

آپ کی علم کی حد یہ ہے کہ پرندوں کی بولیاں جانتے تھے اور سنگریزوں کی تسبیح سے واقف تھے۔ آپؐ نے یہ تمام علوم کسی انسان سے حاصل نہیں کیے تھے۔

آنحضرتؐ کے "اَن پڑھ" ہونے کے لیے دوسری دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ (الاعراف: ۱۵۷)

''وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس کی، جو رسول ہے، نبی ہے اور اُمّی ہے، جسے وہ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور آیت میں فرمایا:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ...... (اعراف:۱۵۸)

''پس تم اللہ اور اس کے رسول نبی اُمّی پر ایمان لاؤ جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے''۔

اور اس سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت کا اُمّی ہونا مسلمات میں سے ہے اور ''اُمّی'' اسے کہتے ہیں جس کے پاس علم نہ ہو اور جو لکھنے پڑھنے سے ناآشنا ہو۔

اس کے جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''اُمّی'' کہا ہے۔ اس کا یہ مقصد بھی ہوسکتا ہے کہ اعلانِ نبوت سے قبل آپ لکھنے پڑھنے سے ناآشنا تھے لیکن اعلانِ نبوت کے بعد آپ لکھنے پڑھنے سے ناآشنا نہیں رہے تھے۔

لفظ ''اُمّی'' کے متعلق یہ کہنا بھی صحیح ہے اس لفظ کا معنی صرف اَن پڑھ ہی نہیں ہے۔ اس کا ایک مفہوم اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مکہ کا ایک نام ''اُم القریٰ'' ہے اور لفظ ''اُمّی'' اس سے منسوب ہے، لہٰذا اُمّی کا ایک معنی یہ ہے کہ اُمّی وہ ہے جو اُم القریٰ یعنی مکہ میں رہتا ہو۔ علاوہ ازیں یہ لفظ اُمت کی طرف بھی منسوب ہوسکتا ہے، یعنی ایسی اُمت جن پر آسمانی کتاب نازل نہ ہوئی ہو۔

رسولؐ خدا کو ''اَن پڑھ'' ثابت کرنے کے لیے ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ جب صلح حدیبیہ میں معاہدہ لکھا جانے لگا تو حضرت علیؑ نے سرنامہ پر یہ عبارت لکھی

تھی: "یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسولؐ اللہ اور سہیل بن عمر کے درمیان طے پایا ہے"۔

اس پر مشرکین مکہ کے نمائندے سہیل نے اعتراض کیا اور کہا: اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مانتے تو آپؐ سے جنگ ہی کیوں کرتے؟ لہٰذا آپ "محمد رسولؐ اللہ" کے الفاظ مٹا کر یہ لکھوائیں کہ "یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمر کے درمیان اتفاق ہوا ہے"۔

رسولؐ خدا نے حضرت علیؑ سے فرمایا: میں ایک لفظ کی وجہ سے جنگ نہیں کرنا چاہتا لہٰذا آپ "رسولؐ اللہ" کے الفاظ مٹا دیں۔

حضرت علیؑ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میں یہ الفاظ مٹانا پسند نہیں کرتا۔

رسولؐ خدا نے فرمایا: اچھا اس لفظ پر میرا ہاتھ رکھو۔ حضرت علیؑ نے "رسولؐ اللہ" کے لفظ پر آپؐ کا ہاتھ رکھا تو آپؐ نے اس لفظ کو اپنے ہاتھ سے مٹا دیا۔ (کشف الغمہ اربلی، جلد اوّل/۲۱۰، ارشاد مفید، جلد اوّل/۱۲۰، اعلام الوریٰ، ص ۹۷)

اگر رسولؐ اللہ لکھنا پڑھنا جانتے ہوتے تو آپؐ خود ہی معاہدہ کی عبارت کو پڑھ لیتے اور حضرت علیؑ سے یہ نہ کہتے کہ اس لفظ پر میرا ہاتھ رکھو۔

ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ تمیم بن جراشہ قبیلہ ثقیف کے ایک وفد کے ساتھ آنحضرتؐ کے پاس آیا اور اس نے کہا: آپ ہمیں ایک دستاویز لکھ دیں جس میں سود اور زنا حلال ہو۔

خالد بن سعید بن العاص نے دستاویز لکھی پھر وہ دستاویز آپؐ کے پاس لائی گئی۔ آپؐ نے ایک شخص سے فرمایا: اسے پڑھو۔ جب پڑھنے والا سود کے لفظ پر پہنچا تو آپؐ نے فرمایا: اس لفظ پر میرا ہاتھ رکھو۔

اس شخص نے آپؐ کا ہاتھ رکھا تو آپؐ نے یہ آیت پڑھی:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ

الرِّبٰوا...... (البقرہ:۲۷۸)

"ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور جو سود باقی بچا ہے اسے چھوڑ دو"۔

اہلِ وفد کا بیان ہے کہ جب ہم نے یہ سنی تو ہمیں تسکین ہوگئی اور ہم نے سود کے حلال ہونے پر دوبارہ اصرار نہ کیا۔

پھر جب زنا کا ذکر آیا تو آپؐ نے اپنا ہاتھ وہاں رکھا اور یہ آیت پڑھی:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً (بنی اسرائیل:۳۲)

'زنا کے قریب مت جاؤ وہ بدترین برائی ہے"۔

پھر آپؐ نے اسے مٹا دیا۔ (اسد الغابہ، جلد اوّل،/۲۱۶)

مذکورہ دلائل کے جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں۔ مذکورہ استدلال بوجوہ صحیح نہیں ہے۔

بخاری نے حدیبیہ کے واقعہ کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں: رسولؐ خدا نے معاہدہ کو اٹھایا اور آپؐ نے اپنے ہاتھ سے یہ الفاظ تحریر کیے:

ھذا ما قاضی محمد بن عبداللہ (صحیح بخاری، جلد دوم /۷۳، طبع ۱۳۰۹ھ)

"یہ وہ معاہدہ ہے جسے محمد بن عبداللہ نے طے کیا ہے"۔

روایت میں یہ الفاظ بھی وارد ہیں:

رسولؐ خدا نے وہ معاہدہ اٹھایا۔ آپؐ اگرچہ اچھی طرح سے لکھنا نہیں جانتے تھے۔ پھر آپؐ نے اپنے ہاتھ سے "رسولؐ اللہ" کی جگہ ھذا ما قاضی علیه محمد بن عبداللہ کے الفاظ لکھے۔ (کشف الغمہ اربلی، جلد اوّل/۲۱۰۔ ارشاد مفید، جلد اوّل/۱۲۰۔ اعلام الوریٰ، ص ۹۷۔ بحارالانوار، جلد ۲۰/۳۵۷، ۳۵۹، ۳۶۳۔

اسد الغابہ، جلد اوّل/۲۱۶۔ صحیح بخاری، جلد دوم/۳/۷، طبع ۱۳۰۹ھ)

ہم نے اپنے ایک مضمون میں یہ واضح کیا تھا کہ یہ روایت بذاتِ خود صحیح نہیں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے رسولؐ خدا کے فرمان سے حکم عدولی کی تھی۔ روایات صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمانِ پیغمبرؐ پر حرف بہ حرف عمل کیا تھا۔ لہٰذا روایت کا یہ حصہ صحیح نہیں ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: آپؑ میرا ہاتھ ان الفاظ پر رکھیں۔

اور اگر بالفرض ہم الفاظ کو صحیح بھی مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسولؐ خدا حضرت علیؑ سے دُور بیٹھے تھے اور آپ اتنی دُور سے عبارت نہ پڑھ سکتے تھے اسی لیے فرمایا کہ میرا ہاتھ اس لفظ پر رکھو۔

اب اگر اس مقام پر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ آنحضرتؐ نے غیبی قوت کو یہاں استعمال کیوں نہ کیا؟ تو ہم کہیں گے کہ ہر مقام پر معجزنمائی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ آنحضرتؐ کو اَن پڑھ ثابت کرنے کے لیے بعض حضرات نے صلح حدیبیہ کی روایت کے تتمہ کے طور پر لکھا کہ جب خوارج نے ابن عباس سے یہ کہا کہ اگر حضرت علیؑ واقعی امیرالمومنین ہوتے تو جب صفین میں حکمین کے لیے معاہدہ لکھا گیا تھا تو حضرت علیؑ نے عمرو بن العاص کے اعتراض پر معاہدہ سے لفظ امیرالمومنینؑ کو کیوں مٹایا تھا؟

اس پر ابن عباسؓ نے انھیں جواب دیا: رسولؐ خدا نے بھی صلح حدیبیہ کے وقت اپنے نام سے پہلے لفظ ''رسولؐ اللہ'' کو مٹایا تھا۔ اگر اس کے باوجود آنحضرتؐ کی رسالت صحیح ہے تو حضرت علیؑ کی امامت بھی صحیح ہے۔

الغرض اس روایت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آنحضرتؐ اَن پڑھ تھے اور جب تک حضرت علیؑ نے انھیں لفظ ''رسولؐ اللہ'' نہیں دکھایا تب تک آپ

کو معلوم نہ تھا کہ یہ لفظ کہاں لکھا ہوا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کتاب ریاض النضرہ، جلد۲/ ۲۷۷، احقاق الحق (الملحقات) جلد ۸/ ۵۲۲، مسند احمد، جلد اوّل/ ۳۴۲ اور خصائص نسائی، ص ۱۴۸ - ۱۴۹ میں لکھا ہے: رسولؐ خدا نے معاہدہ کو اٹھایا اور اپنے ہاتھ سے لفظ رسول اللہ مٹا کر حضرت علیؑ سے فرمایا کہ اب لکھو: ھذا ما صالح علیه محمد بن عبداللّٰہ۔

چلیے، مان لیتے ہیں کہ سائل ہمارے بیان کردہ دلائل پر اگر مطمئن نہیں ہوا تو ہم اسی مطلب کو ایک اور زاویے سے پیش کرتے ہیں۔ آیئے اس سلسلہ میں ہم اپنے علماء کی آرا پر نظر ڈالیں۔

علماء کی آرا

جب ہم اپنے علمائے کرام رضوان اللہ علیہم کی آرا کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں سے بہت سے علماء نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ آنحضرت بعثت کے بعد لکھ بھی سکتے تھے اور پڑھ بھی سکتے تھے۔

شیخ طوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اور ان کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی انفرادی رائے نہیں ہے بلکہ جملہ شیعہ علماء کی رائے ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> والنبی علیه وآله السلام عندنا كان يحسن الكتابة بعد النبوة وانما لم يحنها قبل البعثة (المبسوط، جلد ۸/ ۱۲۰، تفسیر التبیان، جلد ۸/ ۲۱۶)

ہمارے عقیدہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت کے بعد اچھی طرح سے لکھ لیتے تھے جب کہ نبوت سے پہلے آپؐ اچھی طرح سے لکھنا نہیں جانتے تھے۔

سید جواد عاملی لکھتے ہیں: رسولؐ خدا معصوم اور وحی سے تائید یافتہ تھے اور اعلان

نبوت کے بعد آپ کتابت کو جانتے تھے جیسا کہ شیخ، ابوعبداللہ حلی، یوسف نے اس کی وضاحت کی ہے اور "المصحف فی التحریر" میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ شہید نے "النکت" میں شیخ اور ان کے نواسے ابوعبداللہ الحلی کی آرا کو نقل کیا ہے۔ (مفتاح الکرامہ، جلد ۱۰/۱۰)

بہر نوع مذکورہ بالا تمام دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ اعلانِ نبوت سے پہلے اور بعد میں لکھ بھی سکتے تھے اور پڑھ بھی سکتے تھے لیکن مصلحت الٰہی کی وجہ سے آپؐ نے اعلانِ نبوت سے قبل نہ کچھ لکھا تھا اور نہ کسی صحیفہ کو پڑھا تھا۔ آنحضرتؐ کا لکھائی پڑھائی سے دُور رہنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آپ لکھنے پڑھنے سے بالکل عاری تھے۔ آپ لکھائی پڑھائی پر قدرت رکھتے تھے لیکن آپؐ نے عملی طور پر نہ کچھ لکھا تھا اور نہ ہی کسی کتاب کو پڑھا تھا۔ اس ذریعہ سے اللہ نے آپ کی نبوت کی حجت کو مضبوط کیا تھا۔

ہمارے علماء جو آنحضرتؐ کے لکھنے پڑھنے کے قائل ہیں وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں:

① شعبی نقل کرتے ہیں: آنحضرتؐ نے عیینہ بن حصین کا خط پڑھا تھا اور اس کے مضمون کی خبر دی تھی۔ (المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد ۸/ ۹۸، بحوالہ تفسیر نقاش)

② انس راوی ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے شبِ معراج جنت کے دروازہ پر لکھا ہوا دیکھا: صدقہ کا اجر دس گنا ہے اور قرض کا اجر اٹھارہ گنا ہے۔ (سنن ابن ماجہ، جلد ۲/ ۸۱۲، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد ۸/ ۹۷)

③ شیخ صدوق لکھتے ہیں: جعفر بن محمد الصوفی نے حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

سے عرض کیا: فرزندِ رسولؐ! یہ بیان فرمائیں کہ رسولِ خدا کا ایک لقب "اُمّی" کیوں ہے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: لوگ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟

سائل نے کہا: لوگ یہ کہتے ہیں کہ اُمّی وہ ہوتا ہے جو اَن پڑھ اور لاعلم ہو۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: لوگ جھوٹ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ...... (الجمعہ:۲)

"وہی خدا ہے جس نے اُمیوں میں ان میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

اگر آنحضرتؐ خود اَن پڑھ اور لاعلم تھے تو لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم کیسے دیتے تھے؟

آنحضرتؐ بہتر یا تہتر زبانوں کو پڑھ سکتے تھے، ان زبانوں کو لکھ سکتے تھے۔ اللہ نے آپؐ کو اُمّی کا لقب اس لیے دیا کہ آپ مکہ کے رہنے والے تھے اور مکہ "اُم القریٰ" ہے جیسا کہ فرمانِ قدرت ہے:

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (الشوریٰ:۷)

"تاکہ آپ اُم القریٰ (مکہ) اور گردونواح والوں کو تبلیغ کریں"۔

مکہ اُم القریٰ ہے اس کی نسبت سے آپ کو اُمّی کہا گیا ہے۔ (علل الشرائع، ص ۱۲۴، بحار، جلد ۱۶/۱۳۲، بصائر الدرجات، ص ۲۲۵، تفسیر البرہان، جلد ۴/۳۳۲، نورالثقلین، جلد ۲/۸۷، جلد ۵/۳۲۲، معانی الاخبار اور الاختصاص وغیرہ۔ وضاحت:

تفسیر نور الثقلین کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے جو کہ اسی ادارہ کی طرف سے ہوا ہے)

④ عبدالرحمٰن بن حجاج راوی ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: نبی اکرمؐ لکھ پڑھ سکتے تھے۔ (ملاحظہ فرمائیں: بحار، جلد ۱۶/۱۳۳، بصائر الدرجات، ص ۲۲۷، البرہان، جلد ۴/۳۳۳ اور نور الثقلین، جلد ۵/۳۲۲)

⑤ شیخ صدوق نے اپنے اسناد سے علی بن اسباط سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے عرض کیا: لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ رسولؐ خدا لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

آپ نے فرمایا: خدا ان پر لعنت کرے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ (الجمعہ:۲)

"وہی تو ہے جس نے اُمیین میں ایک رسول بھیجا جو ان میں سے ہے، وہ ان پر آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے، انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلم کھلا گمراہی میں تھے"۔

اگر رسولؐ خدا اَن پڑھ تھے تو کتاب وحکمت کی تعلیم کیسے دیتے تھے؟

راوی کہتا ہے: میں نے عرض کیا: اگر یہ معاملہ ہے تو اللہ نے اپنے حبیب کریمؐ کو "اُمی" کیوں کہا؟

حضرت امام علیہ السلام نے جواب دیا: آنحضرت مکہ میں رہتے تھے اور مکہ کو قرآن مجید میں "اُم القریٰ" کہا گیا ہے جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے:

لِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (الشوریٰ:۷)

''تاکہ آپ اہلِ مکہ اور اس کے گردوپیش کے لوگوں کو تبلیغ کریں''۔

مکہ اُم القریٰ ہے اور اسی نسبت سے اللہ نے آپ کو اُمی کہا ہے۔ (بحار، جلد ۱۶/۱۳۳، علل الشرائع، ص ۱۲۵، تفسیر البرہان، جلد ۲/۳۳۲، ۴۰، نورالثقلین، جلد ۵/۳۳۲، بصائر الدرجات، ص ۲۲۶، تفسیر عیاشی، جلد ۲/۷۸)

۶ شعبی لکھتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات سے قبل لکھنے لگ گئے تھے۔ (الجامع للحکام القرآن، جلد ۱۳/۳۵۲، الترتیب الاداریہ، جلد اوّل، ۱۷۳، بحار، جلد ۱۶/۱۳۵)

علامہ مجلسی لکھتے ہیں: شعبی اور اہلِ علم کی ایک جماعت سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات سے پہلے لکھنے لگ گئے تھے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ صحاح ستہ میں حدیث قرطاس موجود ہے جس میں آپؐ نے فرمایا: میرے پاس دوات اور لکڑی کا کاشہ لے آؤ میں تمھیں ایسی دستاویز لکھ کر دوں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ (بحار، جلد ۱۶/۱۳۵)

۷ سیوطی نے اپنی اسناد سے لکھا ہے: عبداللہ بن عتبہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی وفات سے پہلے پڑھنے لگ گئے تھے اور لکھنے لگ گئے تھے۔

میں نے کہا: یہ تو شعبی نے حدیث میں بیان کیا ہے۔

اس نے کہا: شعبی نے سچ کہا ہے۔ میں نے اپنے علماء کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے۔ (درمنثور، جلد ۳/۱۳۱)

۸ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: حضرت علی علیہ السلام

کثرت سے یہ کہا کرتے تھے کہ حضرت ابوبکر وعمر نے رسولؐ خدا کو دیکھا کہ آپ سورۂ انا انزلناہ کو خشوع اور گریہ سے پڑھ رہے تھے۔

ان دونوں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! اس سورت پر آپ کو اتنی رقت طاری کیوں ہوجاتی ہے؟

آپؐ نے فرمایا: میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں اور میرا دل اسے یاد کر چکا ہے اور اس کے بعد کے منظر کو بھی میں نے دیکھا ہے۔

انھوں نے عرض کیا: وہ منظر کیا ہے؟

آپؐ نے ان کے سامنے خاک پر یہ آیت لکھی: تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا...... (القدر:۳)۔(الکافی، جلد اوّل/۲۴۹، تفسیر نورالثقلین، جلد۵/۳۲۳، ۶۳۳)

اس روایت کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آنحضرت لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ الغرض مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آنحضرتؐ نبوت سے قبل اور نبوت کے بعد لکھنے پڑھنے سے آشنا تھے لیکن مصلحت الٰہی کی وجہ سے آپؐ نے اعلانِ نبوت سے قبل نہ تو کچھ لکھا تھا اور نہ ہی کوئی کتاب پڑھی تھی۔

کیا حضرت علیؑ نے حدیبیہ میں فرمانِ رسولؐ پر عمل کیا تھا؟

سوال کیا حضرت علی علیہ السلام ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے آنحضرتؐ کے فرمان پر فی الفور عمل کر کے سر منڈوایا تھا یا انھوں نے بھی باقی لوگوں کی طرح سے تاخیر کی تھی؟

جواب ہم پہلے اس سوال کا پس منظر بیان کرتے ہیں، پھر اس کا جواب دیں گے۔

جب حدیبیہ میں صلح نامہ پر دستخط ہو گئے تو اس میں ایک شرط یہ تھی کہ اس سال مسلمان زیارت کعبہ نہیں کریں گے۔

اس معاہدہ کے بعد رسولؐ خدا نے اپنے صحابہ سے فرمایا: اُٹھو اور قربانیوں کو نحر کرو اور سر منڈواؤ۔ لیکن کوئی کھڑا نہ ہوا۔ آپؐ نے تین بار یہ جملے دُہرائے پھر بھی کوئی کھڑا نہ ہوا۔ آنحضرتؐ اپنی بیوی اُمِ سلمہؓ کے خیمہ میں گئے اور ان سے لوگوں کے رویہ کی شکایت کی۔

بی بی اُمِ سلمہؓ نے کہا: اگر واقعی آپؐ ایسا کرنا چاہتے ہیں تو کسی کو کچھ نہ کہیں، آپؐ اپنی قربانی خود نحر کریں اور حجام کو بلا کر اپنا سر منڈوائیں...... (تاریخ طبری، جلد۲/۲۸۳، البدایہ والنہایہ، ص ۲۰۰)

اس سوال کا جواب یہ ہے:

حضرت علیؑ نے پوری زندگی فرمانِ رسولؐ سے کبھی سرتابی نہیں کی تھی خود حضرت علیؑ پوری زندگی یہ کہتے تھے:

وانی واللّٰہ لم اخالف رسول اللّٰہ ولم اعصہ فی امر قط

(امالی مفید، ص ۲۳۵، امالی طوسی، ص ۱۱، نہج البلاغہ، ۲/۱۷۱)

"میں نے پوری زندگی رسولِ خدا کے فرمان کی کبھی مخالفت اور نافرمانی نہیں کی تھی"۔

ہمیں سابقہ روایت پر یہ اعتراض ہے کہ ہم یہ کیسے مان لیں کہ جب لوگوں نے آنحضرتؐ کے فرمان پر عمل نہ کیا تو آپؐ نے بی بی اُمِ سلمہؓ سے اس کا شکوہ کیا اور بی بی نے آپ کو اس کا حل بتایا۔

سوال یہ ہے کہ اُم المومنینؓ کی عقل و بصیرت نعوذ باللہ خاتم الانبیاءؐ کی عقل و بصیرت سے زیادہ تھی۔ انھیں تو اس کا حل سجھائی دے گیا لیکن عقلِ کُل کے مالک کو اس کا سیدھا سا حل دکھائی نہ دیا۔

بہر نوع اگر ہم اپنے اس تحفظ سے ہٹ کر بھی بات کریں تو اس کا معنی یہ ہے

کہ آنحضرتؐ نے یہ جملے صلح حدیبیہ پر اعتراض کرنے والوں کے لیے فرمائے تھے۔ کیونکہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ معترضین میں سے کوئی بھی "نحر اور تحلیق" کے لیے نہیں اُٹھا تھا۔

اس سلسلہ کی روایات کا ماحصل یہ ہے کہ اس سفر میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن پر سر منڈوانا فرض تھا لیکن ان لوگوں نے صلح کے عمل پر اعتراض کیا تھا اسی لیے وہ سر منڈوانے کے لیے نہیں اُٹھے تھے۔ پھر جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ احرام سے آزاد ہونا ضروری ہے تو انھوں نے مجبور ہوکر بال چھوٹے کرائے تھے، یعنی تحلیق کی بجائے تقصیر پر عمل کیا تھا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل روایات میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

ابن ہشام نے ابن اسحاق سے، اس نے عبداللہ بن نجیح سے، اس نے مجاہد سے، اس نے ابن عباس سے روایت کی کہ روزِ حدیبیہ کچھ لوگوں نے سر منڈوایا تھا اور کچھ لوگوں نے تھوڑے سے بال کٹوائے تھے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یرحم اللہ المحلقین "اللہ سر منڈوانے والوں پر رحم فرمائے"۔

لوگوں نے کہا: یارسولؐ اللہ! اس کے ساتھ "مقصرین" بال کٹوانے والوں کو بھی شامل کریں۔

آنحضرتؐ نے پھر فرمایا: اللہ سر منڈوانے والوں پر رحم فرمائے۔

لوگوں نے کہا: یارسولؐ اللہ! ان کے ساتھ مقصرین کو بھی شامل کریں۔

آنحضرتؐ نے پھر فرمایا: اللہ سر منڈوانے والوں پر رحم فرمائے۔

لوگوں نے کہا: یارسولؐ اللہ! سر کے بال کٹوانے والوں کے لیے بھی دعا فرمائیں۔

اس وقت آپؐ نے فرمایا: بال کٹوانے والوں پر بھی رحم فرمائے۔

لوگوں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! اس کی کیا وجہ ہے کہ آپؐ نے سر منڈوانے

والوں کے لیے زیادہ دعا کی ہے اور بال کٹوانے والوں کے لیے انتہائی قلیل دعا کی ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: سر منڈوانے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے شک نہیں کیا تھا۔ (سیرت ابن ہشام، قسم ثانی، ص ۳۱۹، تاریخ طبری، جلد ۲/۲۸۳)

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو شک تھا وہ بال کٹوا کر احرام سے آزاد ہوئے تھے، جب کہ اتباعِ رسول کا تقاضا یہ تھا کہ سر منڈوائیں۔

قمی کی روایت کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی اطاعت میں سر منڈوائے تھے اور بعض ایسے تھے جنھوں نے احرام سے آزاد ہونے کے لیے بال کٹوانے پر اکتفا کیا تھا اور رسولؐ خدا کے فرمان کے تحت انھوں نے تحلیق نہیں کرائی تھی اور قربانی ساتھ لے کر آنے والوں میں بھی کچھ شک کرنے والے تھے۔

قمی کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اُونٹوں کو نحر کرو اور سر منڈواؤ۔

لوگ کہنے لگے کہ نحر کیسے کریں اور تحلیق کیسے کریں جب کہ ابھی تک تو ہم نے بیت اللہ کا طواف نہیں کیا اور صفا و مروہ میں سعی نہیں کی؟

لوگوں کے اس رویے سے رسولؐ خدا مغموم ہوئے اور آپؐ نے (لوگوں کو دین کی مضبوطی دکھانے کے لیے) اُمِ سلمہؓ سے شکایت کی۔

بی بی نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! آپ اپنی قربانی نحر کریں اور سر منڈوا کر احرام سے آزاد ہو جائیں۔

رسولؐ خدا نے قربانی کی اور سر منڈوایا۔ آپؐ کے اس عمل کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے یقین اور کچھ نے شک کی حالت میں قربانیاں کیں اور سر منڈوائے۔

رسولؐ خدا نے قربانی کی عظمت کو واضح کرنے کے لیے فرمایا:

یرحم اللہ المحلقین "اللہ تحلیق کرنے والوں پر رحم فرمائے"۔

جو لوگ قربانی ساتھ نہ لائے تھے ان پر تحلیق فرض نہ تھی۔ انہوں نے آپؐ سے کہا: یا رسولؐ اللہ! جن لوگوں نے بال کٹوائے ہیں ان پر اللہ رحم فرمائے۔

آپؐ نے فرمایا: خدا تحلیق کرنے والوں پر رحم فرمائے۔

ان لوگوں نے پھر عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! تقصیر کرنے والوں کے لیے بھی دعا فرمائیں۔ اس وقت آپؐ نے ان کے لیے دعا کرتے ہوئے فرمایا: رحم اللہ المقصرین "اللہ تقصیر کرنے والوں پر رحم فرمائے"۔ (تفسیر قمی، جلد ۲/۳۱۴)

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ رسولؐ خدا نے تحلیق کرنے والوں پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور جن لوگوں نے تقصیر پر اکتفا کیا تھا، ان سے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تقصیر کرنے والوں نے آنحضرتؐ کے فرمان کی تعمیل نہیں کی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت علیؑ مقصرین کے بجائے محلقین میں شامل تھے۔ کیونکہ آپ کی وفاداری اور اطاعت شعاری ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔

حضرت علیؑ کی پوری زندگی اطاعتِ رسولؐ سے عبارت تھی۔ آپؑ کی عظیم وفاداریوں کی وجہ سے اللہ نے انہیں آیت تطہیر کا مصداق قرار دیا۔ آپؑ کی فرماں برداری ہر طرح کے شک وشبے سے بالا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آیت نجویٰ نازل فرمائی تو آپؑ کے علاوہ کسی کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ آپ پوری زندگی رسولؐ خدا کے نقشِ قدم پر چلتے رہے اور اللہ نے آپؑ کے متعلق یہ گواہی دی: وَ یَتْلُوْہُ شَاهِدٌ مِّنْهُ "ایک شاہد اس کے پیچھے چل رہا ہے"۔

آپؑ نے اپنی اتباع کی کیفیت کو یوں بیان کیا۔ کنت اتبعه اتباع الفصیل باثرامه (نہج البلاغہ خطبہ قاصعہ سے اقتباس) "میں آپؐ کے پیچھے یوں چلا کرتا تھا جیسا کہ اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے"۔

سوال سہو رسولؐ کے لیے شیخ صدوق کی کیا رائے تھی؟

جواب کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ یہ ثابت کریں کہ حضرت شیخ صدوق عام انسانوں کی طرح سے رسولِؐ خدا کے لیے بھی سہو کا عقیدہ رکھتے تھے۔ جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ رسولِؐ خدا کے لیے سہو کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے بلکہ "اِسہا" کا عقیدہ رکھتے تھے اور ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔

سہو کے معنی بھولنے کے ہیں اور "اِسہا" کا معنی ہے بھلا دیا جانا۔ نبی اکرم کبھی نہیں بھولے تھے البتہ خدا نے ان پر سہو طاری کر دیا تھا اور خدا نے آنحضرتؐ پر سہو اس لیے طاری کیا کہ کہیں لوگ ان کے متعلق غلو نہ کریں۔ اگر سہو ہوتا تو اس کی نسبت رسولِؐ خدا کی طرف ہوتی۔ یہاں مسئلہ "اِسہا" ہے جس کی نسبت خدا کی طرف ہے اور ہر چیز کا مالک اور متصرف ہے۔

ہم نے اپنی کتاب "الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم" میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور ہم نے اپنی کتاب میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ علماء نے شیخ صدوق کے مسئلہ اِسہا کی بھی تردید کی ہے جسے اس مسئلہ کی تفصیل جاننے کا شوق ہو تو اسے چاہیے کہ وہ علم الکلام کی کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

ائمہ اور حضرت زہرا علیہم السلام کی ولایت تکوینی کا عقیدہ

سوال آپ چہاردہ معصومینؑ کے لیے بالعموم اور حضرت سیدہ خاتونِ جنت سلام اللہ علیہا کے لیے بالخصوص ولایت تکوینی کا کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟

جواب جہاں تک حضرت سیدہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ولایت تکوینی کا تعلق ہے تو ہم نے مقامِ زہراؑ کی احادیث کے ضمن میں لکھا ہے کہ ان تمام احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت زہراؑ کو بھی وہی مقام حاصل ہے جو کہ آئمہ علیہم السلام کو

حاصل ہے۔ جہاں تک ولایت تشریعی کا تعلق تو یہ بات ثابت ہے کہ رسولؐ خدا نے ظہر، عصر اور عشاء کی نمازوں میں آخری دو رکعات کا اضافہ کیا تھا اسی لیے انھیں لفظ سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور سفر میں وہ ختم ہو جاتی ہیں جب کہ پہلی دو رکعات فرض ہیں۔

نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ جو چیز نبیؐ کے لیے ثابت ہے وہ امامؑ کے لیے بھی ثابت ہے البتہ استثنائی موارد علیحدہ ہیں۔

عالمِ ذر اور جبر و اختیار

سوال جناب عالی! کچھ دن قبل چند ایمانی بھائیوں سے گفتگو ہوئی اور اس گفتگو میں "عالمِ ذر" پر بحث ہوئی۔ ایک بھائی نے کہا: دنیا میں ہر شخص وہی پیشہ اپناتا ہے جس کا انتخاب اس نے عالمِ ذر میں کیا ہوتا ہے مثلاً جس نے عالمِ ذر میں تجارت کا انتخاب کیا تھا تو وہ دنیا میں تجارت ہی کرے گا اور جس نے منصبِ نبوت کا انتخاب کیا تھا، خدا اسے دنیا میں نبوت عطا کرے گا اور جس نے زنازادہ ہونا پسند کیا تھا وہ زنازادہ بن کر ہی پیدا ہوگا۔ الغرض یہ جہان دنیا عالمِ ذر کی تطبیق پر مشتمل ہے۔

اس گفتگو کا اس بھائی نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم کسی زنازادہ کو زنازادہ کہیں۔ یہ فیصلے عالمِ ذر میں ہو چکے ہیں اور یہ کہ ہم غلط کاموں کے انتخاب کو خدا کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ غلط کرداروں کا ہم نے خود ہی چناؤ کیا تھا۔

آپ واضح کریں کہ کیا یہ نظریہ درست ہے اور کیا یہ نظریہ نصوص اور عقل سے ثابت ہے اور اس کے ساتھ اگر آپ مصادر کی نشان دہی بھی کر دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔

جواب قرآن کریم میں عالمِ ذر کے متعلق یہ آیت مجیدہ موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ○

"جب تمھارے پروردگار نے فرزندِ آدمؑ کی پشتوں سے ان کی ذریت کو لے کر خود انھیں ان کے اُوپر گواہ بنا کر سوال کیا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا: کیوں نہیں ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ عہد اس لیے کہ روزِ قیامت یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس سے غافل تھے"۔ (اعراف:۱۷۲)

روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے "روزِ اَلست" اپنی ربوبیت اور رسولؐ خدا کی نبوت اور امیرالمومنین علیہ السلام کی ولایت کا عہد لیا تھا اور ملائکہ کو اس میثاق کا گواہ بنایا تھا۔

اس کے علاوہ جہاں تک آپ کے موقف کا تعلق ہے کہ ہر شخص نے اس جہان میں اپنی زندگی کا خود فیصلہ کیا تھا اور جس نے جس طرح کی زندگی کا انتخاب کیا تھا وہ اس جہانِ دنیا میں آکر ویسی ہی زندگی بسر کرے گا۔

اس نظریہ کی تائید نہ تو قرآنِ مجید سے ہوتی ہے اور نہ ہی روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس امر کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔

سوال کیا روزِ آخرت حیوانات سے بھی حساب لیا جائے گا اور کیا انھیں بھی سزا ملے گی؟

جواب کچھ روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر سینگ والے جانور نے سینگ کٹے جانور کو مارا ہوگا تو قیامت کے دن اس سے بھی قصاص لیا جائے گا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث مبنی بر کنایہ ہے۔ سینگ والے جانور سے وہ انسان مراد ہے جس کے پاس قوت اور وسائل ہیں اور سینگ کٹے جانور سے بے بس اور لاچار انسان مراد ہیں اور حدیث کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی صاحب اقتدار اور وسائل رکھنے والے شخص نے کسی بے بس اور لاچار پر ظلم کیا ہوگا تو قیامت کے دن خدا اس سے بدلہ لے گا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مفہوم صحیح بھی ہو تو بھی حدیث میں جانوروں کی بات کی گئی ہے انسانوں کی نہیں۔ اور مفہوم حدیث یہ بھی ممکن ہے کہ جب، جانوروں سے ظلم و جبر کا قصاص لیا جائے گا تو انسانوں سے تو بدرجہ اَولیٰ لیا جائے گا کیونکہ جانور کے مقابلہ میں انسان صاحب عقل ہے اور انبیاء و رسل نے اسے حق و صداقت کی دعوت بھی دی ہے۔

کچھ آیات ایسی بھی ہیں جن میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مثلاً ارشاد خداوندی ہے:

وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ○ (التکویر: ۵)

''اور جب جانور محشور کیے جائیں گے''۔

یاد رہے کہ جانوروں کی دو اقسام ہیں:

پہلی قسم میں وہ جانور ہیں جن کی غذا فطری طور پر دوسرے جانوروں کا گوشت ہے اور ان کی زندگی گوشت خوری پر موقوف ہے لہٰذا اگر اس جنس کا جانور کسی دوسرے جانور کا شکار کرے تو وہ قابل مواخذہ نہیں ہے مثلاً شیر، چیتا اور شکاری پرندے۔

اور اگر اس کے برعکس کوئی جانور اپنی فطرت سے ہٹ کر کسی پر ظلم کرے تو خدا

اس سے بدلہ لے گا مثلاً ایک گھاس چرنے والا جانور اپنی حیوانی فطرت کو چھوڑ کر کسی دوسرے جانور کا شکار کرے تو یہ ظلم ہے اور خدا اس سے قصاص لے گا کیونکہ اس نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ خداوند عالم اسے آخرت میں سزا دے گا۔ البتہ اسے اس کے مناسب حال سزا ضرور ملے گی۔ پھر وہ مٹی میں مل کے مٹی بن جائے گا اس کے لیے جنت و دوزخ نہیں ہوگی۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے کچھ جانوروں کا گوشت حلال کیا ہے اور انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ شرعی طریقہ سے انھیں ذبح کر کے ان کا گوشت کھائے۔ اب اگر کوئی انسان انھیں شرعی طریقہ سے ذبح نہ کرے یا کوئی انسان حلال کردہ جانوروں کے علاوہ دوسرے جانوروں کا گوشت کھانے لگے تو اس سے اس کا حساب لیا جائے گا اور اسے دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

سوال جب جانور صاحب عقل ہی نہیں تو انھیں سزا کیوں دی جائے گی؟

جواب جی ہاں! یہ سچ ہے کہ جانوروں کے پاس انسان کے برابر عقل نہیں ہے لیکن ان کے پاس ایک مخصوص قسم کا ادراک و احساس یقینی طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ کہنا کسی طور پر صحیح نہیں ہے کہ انسان کے علاوہ باقی جان دار ادراک و احساس سے عاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دیگر موجودات کے ادراک کو بیان کیا ہے اور فرمایا ہے:

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ○ (بنی اسرائیل:۴۴)

"کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو خدا کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بے شک خدا بُردبار اور بخشنے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے موجودات کو ذوی العقول سے تعبیر کیا اور تسبیحها کی بجائے

تسبیحھم کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام موجودات حقیقی تسبیح کرتی ہیں۔ اسے زبان تکوینی کا نام دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ تسبیح تکوینی کا تمام انسان احساس کر سکتے ہیں۔

سوال اگر موجودات میں ادراک ہوتا تو وہ تکلیف شرعی کے حامل بھی ہوتے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ مکلف نہیں ہیں؟!

جواب اگر اس سے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسی تکلیف شرعی مراد ہے تو اس کے مکلف صرف انسان ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودات مطلقاً غیر مکلف ہیں۔ ان کی تکلیف شرعی کی نوعیت انسانوں کی تکلیفِ شرعی سے جدا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا فَقَالَ لَهَا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ○ (حم السجدہ:11)

"اس کے بعد اس نے آسمان کا رُخ کیا جو کہ بالکل دھواں تھا اسے اور زمین کو حکم دیا کہ بخوشی یا کراہت سے ہمارے حکم کی تعمیل کرو۔ دونوں نے کہا کہ ہم خوشی سے تعمیلِ حکم کریں گے"۔

ارض وسماء کا یہ جواب کہ ہم بخوشی تعمیل حکم کریں گے، اس بات کی دلیل ہے کہ انھیں تعمیل حکم کا فرمان جاری کیا گیا تھا۔ مقصد یہ ہے کہ ہر چیز مکلف ہے لیکن ہر چیز کی تکلیف اس کی حالت کے مطابق ہے۔

❁❁❁

دوسرا حصّہ

تذکرہ اہلِ بیتؑ

کیا کربلا میں شادی ہوئی تھی؟

سوال جناب عالی! ہم بحرین میں رہتے ہیں۔ یہاں کے خطباء کربلا میں ایک شادی کی روایت پڑھتے ہیں جسے سید ہاشم بحرانی نے لکھا ہے: اس کے ساتھ ملا عطیہ الجبری کے اشعار بھی پڑھے جاتے ہیں۔ جب ہم نے آپ کی کتاب کربلا فوق الشبہات کا مطالعہ کیا تو آپ نے بھی وہاں اس طرح کا اشارہ کیا ہے، اس امر کی وضاحت مطلوب ہے۔

جواب شاید آپ کا اشارہ اس عقد کی طرف ہے جس کا تذکرہ سید ہاشم بحرانی نے "مدینۃ المعاجز"[1] میں کیا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب دولہا کی موت یقینی تھی تو اس حالت میں نکاح کرنے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی بھی خاتون کے لیے شہید کی بیوہ ہونا بہت بڑا اعزاز ہے۔

روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ عقد امام حسن علیہ السلام کی وصیت کے تحت ہوا تھا۔ بہر نوع اگر روایت کے اسناد صحیح ہوں تو اس کے بیان کرنے میں کوئی

---

[1] سید ہاشم بحرانی کی مشہور عالم کتاب "مدینۃ المعاجز" کا ادارہ ہذا کی طرف سے اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے اُردو ترجمہ کا نام "معجزات آلِ محمدؐ" ہے اور یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

مضائقہ نہیں ہے۔ البتہ اگر اس روایت کے مصادر غیر صحیح ہوں تو پھر اس کے بیان کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

کیا مصائب آلِ محمدؐ کا جاننا ضروری ہے؟

سوال جناب عالی! حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

من لم یعرف سوء ما اوتی الینا من ظلمنا وذهاب حقنا وما رکبنا به فهو شریك من اتٰی الینا فیما ولینا به

(عقاب الاعمال، ص ۲۰۸، بحار الانوار، جلد ۲۷، ص ۵۵)

(جسے ہم پر روا جانے والے ظلم اور ہمارے حق کے غصب ہونے کا علم نہ ہو تو وہ بھی ظالم کے ساتھ شریک ہے)

آپ سے گزارش ہے کہ اس حدیث کا مفہوم بیان فرمائیں۔

جواب جب کوئی انسان اپنے اختیار سے راہِ تکامل کا سفر طے کرتا ہے تو اس کا ایمان مضبوط ہوتا ہے اور ایسا شخص منزلِ یقین پر فائز ہوتا ہے۔

اس سفرِ تکامل کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو اسرارِ حیات کا علم ہو، خدا کی قدرت سے آگاہی ہو اور خدا کے انبیاء و مرسلین کے حالات سے واقفیت ہو اور اولیائے الٰہی نے دین کی حفاظت کے لیے جن مصائب و مشکلات کا سامنا کیا تھا ان سے آگاہی ہو۔

جب کوئی انسان خاندانِ رسولؐ کی قربانیوں کو دیکھتا ہے اور ان کے مصائب پر نظر کرتا ہے تو اسے یہ جاننے میں ذرا بھی دیر نہیں ہوتی کہ اسلام دین حق ہے اور اگر اسلام دین حق نہ ہوتا تو رسول اللہؐ کا خاندان اتنی اذیتوں کو برداشت نہ کرتا۔

علاوہ ازیں مصائب آلِ محمدؐ سے واقفیت حاصل کرنا اس لیے بھی ضروری ہے

کہ اس سے اجرِ رسالت کی ادائیگی ہوتی ہے۔

جب کوئی مومن حضرت علی علیہ السلام، حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا اور ائمہ طاہرین بالخصوص حضرت امام حسین علیہ السلام پر روا رکھے جانے والے مصائب کو دیکھتا ہے اور آلِ محمدؐ کے صبر واستقلال کو دیکھتا ہے تو اس سے اسے بھی ثبات قدم کا درس ملتا ہے اور معرفتِ آلِ محمدؐ میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس کا عملی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محبت آلِ محمدؐ میں اضافہ ہوتا ہے اور دشمنانِ دین سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان کو آلِ محمدؐ سے محبت ہوگی تو وہ اعمالِ صالحہ بجا لائے گا اور جب دشمنانِ حق سے نفرت ہوگی تو انسان ان جیسے اعمال کرنے سے اجتناب کرے گا۔ آلِ محمدؐ نے اپنے مصائب پر گریہ کا ثواب بیان کیا اور انھوں نے فرمایا: جو اُن پر روئے یا رونے کی شکل بنائے یا ان کے متعلق اشعار کہے تو خدا اسے اجرِ عظیم عطا کرے گا۔

آلِ محمدؐ اپنے شعراء کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور انھیں انعامات سے نوازتے تھے اور آلِ محمدؐ اپنے گھروں میں مجالسِ عزا منعقد کیا کرتے تھے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے آٹھ سو درہم مخصوص کیے تھے کہ یہ رقم ان عورتوں کو دی جائے جو اُن کی وفات کے بعد منیٰ میں ان کی مرثیہ خوانی کریں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا تھا: مرثیہ خوانی کا دس سال تک اہتمام ہونا چاہیے۔

ہمیں آلِ محمدؐ پر ڈھائے جانے والے مظالم کا صرف علم ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان کی سیرت بھی اپنانی چاہیے۔

امام حسن وحسین علیہم السلام کے حمل میں کتنا فاصلہ تھا؟

سوال بعض روایات میں بیان کیا جاتا ہے کہ امام حسن وحسین علیہم السلام کے مابین صرف حمل کا فاصلہ تھا۔ اور یہ بھی کہا جاتا

ہے کہ امام حسین علیہ السلام چھے ماہ تک شکمِ مادر میں رہے تھے۔
جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی ولادت پندرہ رمضان کو ہوئی اور اس سے اگلے سال امام حسینؑ کی ولادت تین شعبان کو ہوئی تھی۔ اس اختلاف کے متعلق وضاحت فرمائیں؟

جواب تاریخ میں حسنین کریمین علیہما السلام کی ولادت کے متعلق متعدد اقوال موجود ہیں۔ جہاں تک امام حسنؑ کی ولادت اور امام حسینؑ کے انعقادِ نطفہ کے متعلق ایک طہر کی روایت ہے تو یہ روایت مشکوک ہے۔ ہم نے اپنی کتاب مأساۃ الزہراء، جلد اوّل/۹۵-۱۰۳ میں اس امر کی تفصیلی بحث کی ہے اور یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت زہراؑ حیض و نفاس کی غلاظت سے پاک تھیں اور اس پر سُنّی شیعہ سب کا اتفاق ہے۔

لہٰذا دونوں بھائیوں کی ولادت اور انعقادِ نطفہ کے لیے ایامِ ولادت یا ایک طہر کی روایت صحیح نہیں ہے۔

امام حسینؑ نے اپنی شہادت کی خبر کیوں دی تھی؟

سوال جنابِ عالی! کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے ہجرتِ مدینہ سے لے کر حدودِ کربلا تک اپنی شہادت کی کوئی خبر نہیں دی تھی۔ کیونکہ آپؑ نے یزید کے خلاف خروج کیا ہوا تھا اور آپ لوگوں کو اپنی مدد کے لیے بلاتے تھے۔ ان حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ لوگوں کو یہ دعوت دیں کہ آؤ میرے ساتھ شمولیت اختیار کرو تاکہ ہم سب مل کر قتل ہو جائیں؟ آپ سے التماس ہے کہ مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

جواب جی ہاں! جب اسلام اتنے خطرات میں گھر جائے کہ فداکاری کے بغیر اس کا وجود محال ہو جائے اور جہاں ایوانِ خلافت سے وحی و نبوت کا انکار بلند ہو رہا ہو تو ان حالات میں لوگوں کو شہادت کی دعوت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (انتہیٰ ملخصاً)

"اسلام محمدی الوجود اور حسینی البقا ہے" کا مطلب کیا ہے؟

سوال جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "اسلام محمدی الوجود اور حسینی البقا ہے" تو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آخر آپ کے اس قول کا کیا مطلب ہے؟ کیا حسینی انقلاب کا اسلام کی سیرت کامل میں کوئی عمل دخل ہے؟

جواب اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اس دور کے مخصوص حالات کا جائزہ لینا ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ معصومینؑ کی نصوص کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں رہبر انقلابِ محمدی حضرت امام حسین علیہ السلام کے خطبات کو ذہن میں رکھنا ہوگا تب کہیں جا کر اس جملے کی حقیقت سامنے آئے گی۔

اس جملہ کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل نکات پر توجہ فرمائیں۔

① حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

انه لم یکن الذی کان منافسة منافی سلطان ولا التماس شیء من مقول الحطام ولکن لنرد المعالم من دینك..... ونظهر الاصلاح فی بلادك فیأمن المظلومون من عبادك وتقام المعطلة من حدودك......

"خدایا! ہماری یہ جدوجہد کسی اقتدار کے حصول کے لیے نہیں تھی اور نہ ہی اسباب دنیا کو حاصل کرنے کے لیے تھی۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ تیرے دین کے نشانات قائم رہیں اور تیرے

شہروں میں اصلاح ہو اور اس کے نتیجہ میں تیرے مظلوم بندوں کو
امن ملے اور تیرے معطل حدود کو پھر سے قائم کیا جائے"۔

امیر المومنینؑ کے کلمات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ کے زمانہ میں دین مٹ رہا تھا۔

② امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

لم یبق من الاسلام الا اسمه ومن الدین الا رسمه

"اسلام کا صرف نام باقی بچا ہے اور دین کے صرف نشان باقی ہیں"۔

③ امام مالک نے اپنے چچا ابی سہیل بن مالک کا یہ قول نقل کیا ہے۔ مجھے دین کے آثار میں سے اذان کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ (موطا مع شرح تنویر الحوالک، جلد اول/۹۳، جامع بیان العلم، جلد ۲/۲۲۳)

زرقانی اور باجی نے اس جملے کی شرح میں یہ لکھا کہ صحابہ یہ کہتے تھے کہ اذان کے علاوہ باقی کوئی چیز اصلی حالت پر باقی نہیں رہی۔ اذان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی جب کہ نماز کو اوقات سے موخر کر دیا گیا۔ باقی تمام افعال میں رد و بدل ہو چکی ہے۔

④ شافعی نے وہب بن کیسان کے طریق سے روایت کی ہے، اس نے کہا:
"میں نے ابن زبیر کو دیکھا کہ وہ خطبہ سے پہلے نماز پڑھتا تھا"۔

وہب بن کیسان کہتے تھے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام سنتیں یہاں تک کہ نماز کو بھی بدل دیا گیا ہے۔ (کتاب الام، امام شافعی، جلد اول /۲۰۸، الغدیر، جلد ۸/۱۶۶، بحوالہ کتاب الام)

⑤ زہری بیان کرتے ہیں کہ میں دمشق میں انس بن مالک صحابی کے پاس گیا۔ وہ اس وقت تنہائی میں بیٹھ کر رو رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا: آپ کیوں رو رہے ہیں؟

انس بن مالک نے جواب دیا: دورِ رسولؐ کی ہر چیز بدل چکی ہے سوائے اس نماز کے اور اسے بھی ضائع کر دیا گیا ہے۔ (جامع بیان العلم، جلد۲/۲۴۴، ضحی الاسلام، جلد اوّل/۳۶۵، الجامع الصحیح، جلد۴/۶۳۲، کتاب الزہد والرقائق، ص ۳۱ کے حاشیہ پر طبقات ابن سعد کے حوالہ سے حالات انس کے ضمن میں یہ روایت موجود ہے۔ بخاری، جلد اوّل/۱۴۱)

۶ حسن بصری کہا کرتے تھے: ''اگر اصحاب رسولؐ بالفرض دنیا میں واپس آجائیں تو وہ تمہارے استقبال قبلہ کے علاوہ تم میں دین کا کوئی اثر نہیں پائیں گے''۔ (جامع بیان العلم، جلد۲/۲۴۴)

ہم یہ کہتے ہیں کہ بعدازاں لوگوں نے قبلہ میں بھی تبدیلی کر دی گئی اور اس کا رُخ بیت المقدس کی طرف کر دیا گیا اور یوں یہودیوں اور مسلمانوں کا قبلہ ایک بنا دیا گیا۔ مزید وضاحت کے لیے ہماری کتاب **الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم** جلد اوّل کا مطالعہ فرمائیں۔

۷ ابوالدرداء نے کہا: مجھے تو دین محمدؐ میں سے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا سوائے اس کے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں۔ (مسند احمد بن حنبل، جلد ۶/۲۴۴)

۸ عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے تھے کہ اگر اس اُمت کے اوائل کے وہ لوگ زندہ ہو کر واپس آجائیں تو انھیں دین کی ایک بھی چیز دکھائی نہ دے گی۔ (الزہد والرقائق، ص ۶۱)

ایک مرتبہ امام صادق علیہ السلام کے سامنے تحریفِ اسلام کا تذکرہ ہوا تو آپؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! رسولِ اکرمؐ جو کچھ لے کر آئے تھے لوگوں نے سب کو چھوڑ دیا ہے بس قبلہ رُخ ہونے کی سنت باقی رہ گئی ہے۔ (بحارالانوار، جلد ۶۸/ ۹۱، قصار الجمل، جلد اوّل/۳۶۶)

⑨ دین میں اتنی تبدیلیاں ہو چکی تھیں کہ جب حضرت علیؑ نے بصرہ میں نماز پڑھائی تو صحابیِ رسول عمران بن حصین نے مطرف بن عبداللہ کا بازو پکڑ کر کہا: اس نے مجھے محمد مصطفیؐ کی نماز یاد دلائی ہے۔ جب ابوموسیٰ نے حضرت علیؑ کے پیچھے نماز پڑھی تو اس نے بھی انہی تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ (حسب ذیل مصادر کی طرف رجوع فرمائیں: انساب الاشراف، جلد۲/۱۸۰، طبع الاعلمی، سنن بیہقی، جلد۲/۶۸، کنز العمال، جلد ۸/۱۴۳، بحوالہ عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ اور مصنف صنعانی، جلد۲/۶۳، مسند ابی عوانہ، جلد۲/۱۰۵، مسند احمد، جلد۴/۳۹۲، ۴۰۰، ۴۱۵، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۱، ۴۴۴۔ الغدیر، جلد۱۰/۲۰۲، ۲۰۳۔ کشف الاستار بحوالہ مسند بزاز، جلد اوّل/۲۶۰، البحر الزخار، جلد ۲/۲۵۴، بخاری، جلد۲/۲۰۹، صحیح مسلم، جلد اوّل/۲۹۵، سنن نسائی، جلد اوّل/۱۶۴، سنن ابی داؤد، جلد ۵/۸۴، سنن ابن ماجہ، جلد اوّل/۲۹۶، فتح الباری، جلد۲/۲۰۹، مصنف ابن ابی شیبہ، جلد اوّل/۲۴۱)

⑩ دین اسلام میں اس قدر ردوبدل ہو گیا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے دورِ امامت میں بہت سے لوگ حتیٰ کہ کچھ ہاشمیوں کو بھی نماز اور حج کے احکام تک معلوم نہ تھے۔ (کشف القناع عن حجیۃ الاجماع، ص ۶۷)

نماز دین کا اہم ترین ستون ہے جسے ہر مسلمان دن میں پانچ بار ادا کرتا ہے۔ اتنا اہم فریضہ بھی طاقِ نسیان ہو چکا تھا اور حالت یہ تھی کہ رسولِ اعظمؐ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے اکثر افراد کو نماز کے شرائط و احکام کا علم نہیں تھا تو باقی لوگوں کو کیا علم ہوگا؟

جب نماز کی یہ کیفیت ہو تو باقی احکامِ اسلام کے متعلق لوگوں کی کیا حالت ہوگی۔

صلحِ حسنؑ کے چیدہ شرائط

حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے عہدِ حکومت میں ناکثین (اصحابِ جمل)

قاسطین (اصحاب صفین) اور مارقین (خوارج) سے جہاد کیا۔ پھر حالات کے جبر نے حضرت امام حسنؑ کو معاویہ کے ساتھ صلح پر مجبور کر دیا۔ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاویہ کے ساتھ جو شرائط صلح طے کیں ان سے یہ واضح ہوگیا کہ آپؑ دین کے سچے وفادار ہیں اور معاویہ اور اس کا گروہ باغی ہے۔ صلح امام حسنؑ کی چیدہ شرائط حسب ذیل تھیں:

① معاویہ کے بعد حکومت حضرت امام حسنؑ کو لوٹا دی جائے گی اور اگر حسنؑ زندہ نہ ہوں تو امام حسینؑ کو لوٹا دی جائے گی۔

② معاویہ کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ کسی کو اپنا ولی عہد مقرر کرے۔

③ حضرت امام حسنؑ معاویہ کے پاس حاضری دینے سے مستثنیٰ ہوں گے۔

④ معاویہ اپنے آپ کو "امیر المومنین" نہیں کہلائے گا۔

⑤ معاویہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسولؐ پر عمل کرے گا۔

⑥ آئندہ معاویہ حضرت علی علیہ السلام کو سبّ وشتم نہیں کرے گا۔

⑦ حضرتؑ کے اصحاب اور ان کے ماننے والوں کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہ کی جائے گی۔

⑧ خدا کی دھرتی پر سب لوگوں کو امن وسکون دیا جائے گا۔

الغرض معاویہ نے حضرتؑ کی تمام شرائط کو تسلیم کیا اور اس پر دستخط کیے۔ مصالحت کے بعد معاویہ عالمِ اسلام کے تمام حصوں پر بلاشرکت غیر متصرف ہوگیا۔ امام علیہ السلام کی شرائط کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ امام علیہ السلام اسے دین کا خادم نہیں سمجھتے تھے اور مصالحت کے بعد معاویہ نے بھی مذکورہ شرائط پر کبھی عمل نہیں کیا تھا۔

امام عالی مقام نے پہلی اور دوسری شرط میں یہ واضح کر دیا کہ حکومت آل علیؑ کا حق ہے اور معاویہ کسی اور کو اپنا جانشین نہیں بنا سکتا۔

دنیا کے ہر متمدن معاشرے میں مصالحت کے شرائط پر عمل کرنے کو ضروری سمجھا جاتا ہے حتیٰ کہ غیر مسلم ممالک بھی اپنے عہدوپیان کی پاسداری کرتے ہیں لیکن معاویہ نے عہدوپیان کو پسِ پشت ڈالا اور یزید کو ولی عہد مقرر کیا اور لوگوں سے بزورِ شمشیر اس کی بیعت لی اور اس کے نتیجہ میں یزید کی حکومت قائم ہوئی۔

معاہدہ صلح کی رُو سے نہ تو معاویہ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ کسی کو اپنا جانشین مقرر کرے اور نہ ہی یزید کو یہ حق تھا کہ وہ مسندِ حکومت پر آئے۔ اس زمانہ میں حکومت حضرت امام حسینؑ کا حق تھی لہٰذا یزید اس معاہدہ کی رُو سے باغی تھا اور خلافت حضرت امام حسینؑ کا حق تھی۔

یاد رکھیے حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزید کے خلاف خروج نہیں کیا تھا اور نہ ہی آپؑ نے بغاوت کی تھی۔ خروج اور بغاوت کا تعلق معاویہ ویزید سے تھا۔ اس سے قبل سقیفائی حکومت نے اگرچہ اپنی من مانیاں کی تھیں مگر اس کے باوجود ان پر تقدس کے پردے پڑے ہوئے تھے اور جب یزید کی حکومت قائم ہوئی تو وہ ظاہری تقدس کے پردے بھی ہٹ گئے تھے۔ اب ان حالات میں حضرت امام حسینؑ نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے اس گلے سڑے فاسد نظام کے خلاف جہاد نہ کیا تو آنے والی نسلیں یہ سمجھیں گی کہ اسلام وہی ہے جو خلفاء کا کردار ہے اور ممکن ہے کہ حساس لوگ خلفاء کی بدکاریوں کو دیکھ کر اسلام کو ہی خیر باد نہ کہہ دیں۔

اس لیے حضرت امام حسین علیہ السلام نے انقلابی اقدام کیا اور اُموی حکومت کے خلاف جہاد کیا۔ اس جہاد میں اگرچہ آپ شہید ہو گئے لیکن آپؑ نے اپنے عظیم عمل سے کائنات کو یہ سبق دیا کہ اسلام اور ہے اور خلفاء کا کردار اور ہے۔ خلفاء کے کردار کو

اسلام کا نام دینا صحیح نہیں ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے حکومت و خلافت کے معیار بتائے۔ آپؑ نے اپنے قیام کا آغاز مدینہ سے کیا تھا۔ جب دربار مدینہ میں آپ سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا تو آپؑ نے یہ فرمایا تھا:

''ہم اہلِ نبوت ہیں، ہم معدنِ رسالت ہیں اور ہم ملائکہ کے آمد و رفت کا مقام ہیں۔ اللہ نے ہم سے افتتاح کیا اور ہم سے ہی اختتام کرے گا۔ یزید ایک شرابی اور نفسِ محترم کا قاتل ہے اور وہ اعلانیہ فسق و فجور کرتا ہے۔ مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا''۔ (مقتل الحسین خوارزمی، جلد اول/۱۸۴، الفتوح، ابن اعثم، جلد ۵/۱۴۱، مثیر الاحزان، ص ۲۴، بحار الانوار، جلد ۴۴/ ۳۲۵)

خطبۂ حسینیؑ کی تشریح

امام علیہ السلام نے یزید کے متعلق فرمایا کہ وہ ایک شرابی اور نفسِ محترم کا قاتل ہے۔ ایک شرابی اور مدہوش شخص اس لائق نہیں ہے کہ وہ اُمت کے مستقبل کے حکومتی رازوں کی حفاظت کرسکے۔ کیونکہ شراب انسانی عقل کو ضائع کردیتی ہے۔ شرابی عقلی توازن سے محروم ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو اگر اُمت کی سربراہی دے دی جائے تو وہ اُمت کا نقصان کرے گا۔

امام علیہ السلام نے یزید کے لیے ''قاتل و شرابی'' کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے برعکس آپؑ نے یہ نہیں کہا کہ ''اس نے قتل کیا تھا اور شراب پی تھی''۔ اگر آپؑ بالفرض جملے کو اس طرح سے ادا کرتے تو اس کی یہ تاویل ممکن تھی کہ اس نے ماضی میں یہ عمل کیا تھا لیکن پھر اس نے توبہ کرلی تھی۔ لہٰذا آپؑ نے اس طرح کے جملے کے بجائے اسے ''قاتل و شرابی'' کہا اور ان لفظوں سے آپؑ نے یہ پیغام دیا کہ قتل و شراب اس کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔

آپؑ نے یزید کو صرف "قاتل" نہیں کہا بلکہ "قاتلِ نفسِ محترم" کہا۔ اگر صرف قاتل کہتے تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ جی ہاں یزید نے قتل کیا تھا لیکن حق و انصاف کے تقاضوں کے تحت ایسا کیا تھا۔ اس کے بجائے آپؑ نے اسے "قاتلِ نفسِ محترم" کہہ کر رہتی دنیا تک لوگوں کو پیغام دیا کہ یہ شخص ناجائز قتل کرنے کا عادی ہے اور ناحق خون بہانا اس کی فطرت ہے۔

امام عالی مقام نے فرمایا کہ یزید فاسق ہے اور اسے اپنے فسق و فجور پر ناز ہے۔ اس کی نگاہوں میں نیکی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایسا شخص اُمت کی تربیت کے قابل نہیں ہے۔ ایسا شخص لوگوں کو بھلائی کی راہوں پر نہیں چلاسکتا۔

امام علیہ السلام نے یزید کے تین عیوب بیان کیے:

① آپؑ نے فرمایا کہ وہ شرابی ہے۔

② یزید نفسِ محترم کا قاتل ہے۔

③ یزید اعلانیہ فاسق ہے۔

اس کے برعکس حضرتؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ یزید جھوٹ بولتا ہے یا غیبت کرتا ہے یا زنا کرتا ہے۔

حضرتؑ نے اس کے بجائے اس کے اہم جرائم کا تذکرہ کیا جن کے مقابلہ میں یہ جرائم چھوٹے تھے۔ اسی لیے آپؑ نے چھوٹے جرائم کو بیان کرنے سے احتراز کیا تھا۔

آپؑ نے یزید کے منفی پہلو اُجاگر کیے اور اپنے لیے فرمایا:

نحن اهل النبوة ومعدن الرسالة ومختلف الملائکة

"ہم اہلِ بیتؑ نبوت اور معدن رسالتؐ اور ملائکہ کے آمدورفت کا مقام ہیں"۔

امام عالی مقام نے یہ نہیں فرمایا کہ "ہم اہلِ بیت نبیؐ ہیں"۔

اگر آپؑ یہ کہتے کہ ہم اہلِ بیت نبیؐ ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ آپؑ کا آنحضرتؐ سے صرف نسبی رشتہ ہے۔ آپؑ نے اپنے الفاظ سے یہ واضح کیا کہ ہم صرف نبیؐ کے رشتہ دار نہیں ہیں بلکہ نبوت کے رشتہ دار ہیں۔

آپؑ نے فرمایا: ہم احکام رسالتؐ کے امین اور ان کے معدن ہیں۔ ہم ملائکہ کے آمدورفت کا مقام ہیں۔ جب کہ یزید ان صفات سے عاری ہے اور وہ اسلام کے نام پر بدنما داغ ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے گھرانے کے جو اوصاف بیان کیے یہ اوصاف اور کسی گھرانے میں موجود نہیں تھے۔ آپؑ نے فرمایا: ہمارا گھرانا ملائکہ کی آمدورفت کا مقام ہے۔ میں نے اس گھر میں آنکھ کھولی جہاں جبریلؑ اُترتے تھے۔ اور اس کے برعکس یزید وہ ہے جس نے عیسائیوں کے قبیلہ بنی کلاب میں پرورش پائی تھی۔ جس کے پاس سے اسلامی اقدار چھو کر بھی نہیں گزریں۔ یہ صرف خواہشات نفس کا غلام ہے۔

کیا رسولؐ خدا کی آغوش میں پلنے والا اور آنحضرت کی زبان چوس کر پروان چڑھنے والا اور عیسائی خاندان میں پرورش پانے والا برابر ہو سکتے ہیں؟

امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

بنا فتح اللہ وبنا یختم

"اللہ نے ہم سے آغاز کیا اور ہمارے ذریعہ سے ہی اختتام کرے گا"۔

ان الفاظ سے حضرتؑ نے یہ پیغام دیا کہ ہدایت اور صلاح وفلاح کا دروازہ خدا نے ہمارے ہی خاندان کے ہاتھوں سے کھلوایا ہے۔ اور آخری ہادی جس نے

پوری دنیا میں نظامِ اسلام کو نافذ کرنا ہے وہ بھی ہمارے ہی خاندان میں سے ہوگا۔
جب یہ حقیقت ہے تو پھر یزید کی کیا حیثیت ہے کہ وہ ہماری موجودگی میں امامت وزعامت کا دعویٰ کرے۔
کیا یزید یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ فکرِ محمدیؐ کا وارث ہے؟ اور کیا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ شریعت محمدیؐ کو ہم سے بہتر جانتا ہے؟ اور کیا یزید اسلام و مسلمین کی نجات اور کامیابی کی ضمانت فراہم کرسکتا ہے؟
امام علیہ السلام نے اپنے اس خطبہ میں تاریخی جملہ فرمایا:
مثلی لا یبایع مثلہ
"مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا"۔
آپؑ نے اس جملہ میں صرف اپنی بات نہیں کی اور آپؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا۔ اسی طرح سے آپ نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ میں یزید اور یزیدی نظام کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔
اس کی بجائے آپؑ نے یہ فرمایا کہ "مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا"۔
امام علیہ السلام کی شخصیت کیا تھی اس کا اظہار زیارتِ وارثہ کے ان جملوں سے ہوتا ہے:
السلام علیك یا وارث ادم صفوۃ اللّٰہ ، السلام علیك یاوارث نوح نبی اللّٰہ.......... السلام علیك یا وارث ابی محمد حسن بن علی
"اے آدم صفی اللہ کے وارث آپ پر سلام! اے نوح نبی اللہ کے وارث آپ پر سلام، اے ابراہیم خلیل اللہ کے وارث آپ پر سلام۔ اور اے اسماعیل ذبیح اللہ کے وارث آپؑ پر سلام اور

اے موسیٰؑ کلیم اللہ کے وارث آپؑ پر سلام اور اے عیسیٰؑ روح اللہ
کے وارث آپؑ پر سلام اور اے محمدؐ رسول اللہ کے وارث آپؑ پر
سلام اور اے امیرالمومنین علیہ السلام کے وارث آپؑ پر سلام
اور اے امام حسنؑ مجتبیٰ کے وارث آپؑ پر سلام"۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے مقام کو جانتے پہچانتے تھے۔ آپؑ کو علم تھا کہ آپؑ انبیاءؑ کی دستار کے وارث ہیں اور آپؑ جانتے تھے کہ میں آدمؑ کا وارث ہوں اور یزید ابلیس کا وارث ہے۔ میری طرف سے یزید کی بیعت صرف میری بیعت نہیں ہے بلکہ یہ آدمؑ کی طرف سے ابلیس کی بیعت سمجھی جائے گی۔

آپ جانتے تھے کہ میں نوحؑ کی دستار کا وارث ہوں اور یزید اس دور کے کفار کی دستار کے وارث ہے لہٰذا اگر آپ یزید کی بیعت کرتے تو یہ صرف آپ کی بیعت نہ ہوتی بلکہ نوحؑ کی طرف سے کفار کے ہاتھ پر بیعت متصور ہوتی۔

آپؑ جانتے تھے کہ آپ ابراہیمؑ خلیل اللہ کی دستار کے وارث ہیں اور یزید نمرود کی دستار کا وارث ہے۔ لہٰذا اگر آپ اس کی بیعت کر لیتے تو یہ آپ کی طرف سے بیعت شمار نہ ہوتی بلکہ یہ ابراہیمؑ کی طرف سے نمرود کی بیعت شمار ہوتی۔

آپؑ نے دیکھا کہ میرے سر پر موسیٰؑ کلیم اللہ کی دستار ہے اور فرعون کی دستار یزید کے سر پر ہے۔ لہٰذا اگر آپ بیعت کر لیتے تو یہ آپ کی بیعت نہ ہوتی بلکہ یہ موسیٰؑ کی طرف سے فرعون کی بیعت ہوتی۔

اسی طرح سے آپؑ جانتے تھے کہ خاتم الانبیاءؐ کی دستار کا میں وارث ہوں اور ابوجہل کی پگڑی یزید کے سر پر ہے۔ لہٰذا آپؑ کی بیعت آپؑ کی انفرادی بیعت نہ ہوتی بلکہ خاتم الانبیاءؐ کی طرف سے ابوجہل کی بیعت سمجھی جاتی۔

آپؑ جانتے تھے آپؑ کے سر پر امیرالمومنین علیہ السلام کی دستار ہے، لہٰذا

آپؑ کی بیعت صرف آپؑ کی بیعت شمار نہ ہوگی بلکہ امیر المومنینؑ کی طرف سے کسی غاصب حکومت کی بیعت شمار ہوتی۔

آپؑ جانتے تھے کہ آپؑ کے سر پر حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی دستار ہے اور یزید کے سر پر اس کے باپ کی پگڑی ہے لہٰذا آپؑ کی بیعت صرف آپؑ کی انفرادی بیعت نہ ہوتی بلکہ امام حسنؑ کی طرف سے یزید کے باپ کی بیعت سمجھی جاتی۔

اسی لیے آپؑ نے یہ تاریخی جملہ فرمایا: ''مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا''۔

اس جملہ سے آپؑ نے یہ پیغام دیا کہ جس طرح سے میں اس کی بیعت نہیں کرسکتا اسی طرح سے میرے بزرگوں اور انبیاءؑ نے بھی اغیار کی بیعت نہیں کی تھی۔

آپؑ کی شرعی ذمہ داری آپ کو یزید کی بیعت سے مانع تھی۔ چنانچہ آپؑ نے اُمت کے اجتماعی بگاڑ کو روکنے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور سیرتِ رسولؐ اور سیرت امیر المومنینؑ کو قائم کرنے کے لیے یزید کے خلاف قیام کیا اور آپؑ نے اپنے قیام کے مقاصد کو اہلِ کوفہ کے نام ایک خط میں یوں واضح کیا:

انی لم اخرج اشرا ولا بطرا ولا ظالما ولا مفسدا وانما خرجت لطلب الاصلاح فی اُمة جدی اُرید ان امر بالمعروف وانهی عن المنکر واسیر بسیرة جدی رسول الله وابی علی بن ابی طالب فمن قبلنی بقبول الحق الله اولی بالحق ومن رد علی هذا اصبرحتی یقضی الله بینی وبین القوم بالحق والله خیر الحاکمین (بحار الانوار، جلد ۴۴/ ۳۲۹، مناقب آل ابی طالب، جلد ۳/ ۸۹، انتشارات علامہ، قم، ایران)

واضح ہو کہ میں نے نہ تو ازراہِ تکبر نہ ازراہِ زیادتی اور نہ ہی ازراہِ ظلم وفساد خروج کیا ہے۔ اس کی بجائے میں نے اس لیے خروج کیا تا کہ اپنے نانا کی اُمت میں اصلاح کی جستجو کی جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروں اور میں اپنے نانا جناب رسولؐ خدا اور اپنے والد حضرت علی بن ابی طالبؑ کی سیرت پہ چلوں۔ جو میری اس دعوت کو قبول کرے تو قبولِ حق کی اسے خدا جزا دے گا اور جو میری دعوت کو ٹھکرائے تو میں اس پر صبر کروں گا یہاں تک کہ خدا میرے اور ان لوگوں کے خلاف حق کا فیصلہ کرے اور اللہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔

شہیدِ انسانیت حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے خط میں اپنے قیام کے مقاصد کو واضح کیا ہے۔ آپؑ نے یزید جیسے کسی فردِ واحد کے خلاف اپنی جنگ کے عزم کا اظہار نہیں کیا اور آپؑ نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ میں حکومت حاصل کرنے کا خواہش مند ہوں۔

اس کے برعکس حضرتؑ نے یہ فرمایا کہ میرا مقصد اپنے نانا کی اُمت کی اصلاح ہے اور اصلاح ایک ایسا عمل ہے جسے تمام اہلِ دانش بہتر سمجھتے ہیں اور یہ ہر شخص کا شرعی فریضہ ہے کہ وہ اصلاح کے لیے جدوجہد کرے خواہ وہ سرکار کے ساتھ وابستہ ہو یا نہ ہو۔

آپؑ نے اپنے قیام کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قرار دیا۔ اور یہ ایسا الٰہی فریضہ ہے کہ اس کے متعلق کسی طرح کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا۔

امام عالی مقام نے اپنے خط میں واضح کیا کہ میری تحریک خالصتاً الٰہی تحریک ہے جو اس تحریک میں میرا ساتھ دے گا، خدا اسے جزائے خیر دے گا اور جو میری مخالفت کرے گا تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ خدا میرے اور مخالفین کے درمیان حق

کا فیصلہ کرے۔

الغرض امام علیہ السلام نے اپنے اس مکتوب میں اپنی تحریک کے پانچ مقاصد بیان کیے:

① میری یہ تحریک کسی طرح کی سرکشی پر مبنی نہیں ہے۔
② میری تحریک کا مقصد رسولؐ خدا کی اُمت کی اصلاح ہے۔
③ میں امر بالمعروف کرنا چاہتا ہوں۔
④ میں نہی عن المنکر کا خواہش مند ہوں۔
⑤ میں اپنے نانا جان اور والد محترم کی سیرت کو قائم کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا خلیفہ اوّل سے رشتہ

سوال حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منسوب ایک روایت بیان کی جاتی ہے، آپؑ نے فرمایا:

ولدنی ابوبکر مرتین

"مجھے ابوبکر نے دو دفعہ جنم دیا"۔

اس کی وضاحت یوں کی جاتی ہے کہ حضرت ابوبکر کے ایک بیٹے کا نام عبدالرحمٰن تھا اور ان کے چھوٹے بیٹے کا نام محمد تھا۔ عبدالرحمٰن نے اپنی بیٹی کا رشتہ محمد کے بیٹے قاسم کو دیا تھا اور قاسم سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام اُم فروہ تھا۔ وہ لڑکی باپ اور نانا کے لحاظ سے حضرت ابوبکر کی نسل سے تھی۔ بعدازاں اسی بی بی اُم فروہ کا نکاح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ہوا اور ان کے بطن سے امام جعفر صادق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اسی لیے آپؑ کہتے تھے کہ حضرت ابوبکر نے دو بار مجھے جنم دیا تھا۔

آپ سے التماس ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

جواب اس سوال کے متعلق ہم چند گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں:

① یہ روایت صرف سنّی کتابوں میں مذکور ہے شیعہ کتابوں میں یہ روایت موجود نہیں ہے۔

② روایت کے الفاظ بھی کچھ اس طرح کے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ جملے امام علیہ السلام کے نہیں ہو سکتے۔

یہ روایت دار قطنی نے اس سند سے نقل کی ہے:

عن احمد بن محمد بن اسماعیل الآدمی عن محمد بن الحسین الحسنینی عن عبدالعزیز بن محمد الازدی عن حفص بن غیاث قال سمعت جعفر بن محمد یقول ما ارجو من شفاعة علی شیئا الا وانا ارجو من شفاعة ابی بکر مثله لقدولدنی مرتین

"(بحذف اسناد) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کہتے تھے کہ مجھے حضرت علی علیہ السلام کی شفاعت کی جتنی اُمید ہے اتنی اُمید ابوبکر کی شفاعت کی ہے اس نے مجھے دوبار جنم دیا تھا"۔

(تہذیب الکمال، جلد۵/۸۱-۸۲، سیر اعلام النبلاء، جلد۲/ ۲۵۹، طبقات الحفاظ، جلد اوّل/ ۱۶۷، تاریخ دمشق، جلد۴۴/ ۴۵۵)

یہ روایت از روئے سند و متن ضعیف ہے۔ اس روایت کی تضعیف کے لیے حسب ذیل کتب کا مطالعہ فرمائیں:

تہذیب التہذیب، جلد۲/۱۰۳، تذکرۃ الحفاظ، جلد اوّل/۱۲۶، عمدۃ الطالب، ص ۱۷۶، مطبعۃ الصدر، ۱۴۱۷ھ قم، غایۃ الاختصار، ص ۱۰۰، کشف الغمہ، جلد۲/۱۶۱،

طبع ۱۳۸۱ھ، مطبعہ العلمیہ، قم بحوالہ جنابذی، جواہر الکلام ابن وہیب، ص ۱۳، سیر اعلام النبلاء، جلد ۶/۲۵۵، صواعق محرقہ، ص ۸۴، مستند العروہ سید خوئی، کتاب الخمس، جلد اوّل/۳۱۷، تنقیح المقال، جلد ۳/۷۳، در منثور، جلد اوّل/۲۴۰

واضح رہے کہ آخری حوالہ مجھے نہیں مل سکا۔

قرمانی لکھتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی والدہ کا نام اُمِ فروہ تھا اور وہ قاسم بن محمد بن ابی سُمرہ کی صاحب زادی تھی۔ (ملاحظہ فرمائیں: اخبار الاول وآثار الاوّل برحاشیہ، تاریخ کامل، مطبوعہ ۱۳۰۲ھ، جلد اوّل/۲۳۴)

قاسم بن محمد ابی سُمرہ کا نام اگرچہ کتب رجال میں نہیں ملتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں ہزاروں انسان ایسے تھے جن کا نام کتبِ رجال میں دکھائی نہیں دیتا۔ کسی شخص کے ذکر کا کتبِ رجال میں نہ ہونے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ ایک خیالی شخصیت ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ شہید نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی والدہ کے متعلق صرف یہی لکھا کہ ان کا نام اُمِ فروہ تھا اور وہ قاسم بن محمد کی صاحبزادی تھی۔ (بحار الانوار، جلد ۴۷/۱)

"جنابذی" کے علاوہ اور بھی کئی مؤرخین نے لکھا کہ اُمِ فروہ امام محمد باقر علیہ السلام کی نانی تھیں۔ وہ نہ تو امام محمد باقر کی بیوی تھیں اور نہ ہی امام جعفر صادق علیہ السلام کی والدہ تھیں۔ (کشف الغمہ، جلد ۲/۱۲۰، طبع ۱۳۸۱ھ مطبعہ علمیہ قم، ناسخ التواریخ، حیاۃ الامام الصادق، جلد اوّل/۱۱، بحار الانوار، ۴۶/۲۱۸)

مؤرخین کو یہ مغالطہ اس لیے ہوا کہ جب انھوں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے نانا کا نام قاسم بن محمد دیکھا تو انہوں نے بوجہ شہرت اسے قاسم بن محمد بن ابی بکر لکھ دیا۔ اگر کتبِ رجال وتاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو قاسم بن محمد نام کے

بہت سے اشخاص دکھائی دیتے ہیں۔

۳ یہ روایت صرف سُنّی کتب میں پائی جاتی ہے، شیعی کتابیں اس سے خالی ہیں۔

۴ یہ روایت اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مقامِ امامت کے حامل تھے اور وہ خدا کی طرف سے شافع اور مشفّع تھے انھیں بھلا خلیفۂ اوّل کی شفاعت کی احتیاج کیسے ہوسکتی تھی؟!

اور اگر بالفرض آپؑ کو شفاعت کی ہی ضرورت تھی تو آپؑ نے اپنے جدامجد حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا ذکر کیوں نہ کیا۔

بھلا امام جعفر صادق علیہ السلام کو خلیفۂ اوّل سے انتساب پر کیا فخر ہوسکتا تھا جب کہ رسولِؐ خدا اُن کے نانا تھے، وہ اپنے نانا کے انتساب پر فخر کرتے تو کوئی بات بھی تھی۔ رسولِؐ خدا کو چھوڑ کر خلیفہ سے انتساب میں فخر کا کون سا پہلو تھا؟

اور اگر بالفرض اس روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ دین نبویؐ ہے ابوی نہیں ہے۔ دین کا تعلق تابعداری سے ہے، رشتہ داری سے نہیں ہے۔

حضرت نوحؑ کا بیٹا غرق ہوگیا اور ان کی بیوی ڈوب گئی تھی جب کہ فرعون کی زوجہ کا مقام جنت ہے۔

تیسرا حصّہ

خواتین کے بارے میں

عورت حاکم اور قاضی

سوال کیا عورت حاکم اور قاضی بن سکتی ہے؟

جواب اس کا جواب نفی میں ہے۔ اسلامی قانون کے تحت عورت حاکم اور قاضی نہیں بن سکتی ہے۔ پہلے ہم قضاوت کے لیے دلائل پیش کریں گے۔ جب یہ واضح ہوجائے گا کہ ایک خاتون جج اور قاضی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو اس سے خودبخود یہ بات ثابت ہوجائے گی کہ جب عورت قاضی نہیں بن سکتی تو وہ حاکم بھی بدرجہ اولیٰ نہیں بن سکتی۔

اصل بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر خدا کو ہی انسانوں پر حق سلطنت حاصل ہے اور منصب قضاوت میں بھی انسان کو دوسروں پر ایک طرح کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اختیارات کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے۔ پھر اس نے انسانی مصالح کے لیے کچھ اختیارات کو نچلی سطح پر منتقل کیا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے والدین کو اولاد پر ولایت کا حق عطا کیا۔ اور یہ حق اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اولاد کی تربیت اس پر موقوف ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنا شکر ادا کرنے کی انسان کو نصیحت کی وہاں اسے والدین کا شکریہ ادا کرنے کا بھی حکم دیا اور یہ فرمایا کہ معصیتِ الٰہی کے امور کے علاوہ باقی معاملات میں ان کی اطاعت کرنی چاہیے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَنِ اشۡکُرۡلِیۡ وَ لِوَالِدَیۡکَ (لقمان:۱۴)

''میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا شکر ادا کر''۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرے کے نظم و نسق کو قائم رکھنے کے لیے انبیاءؑ و اوصیاءؑ کو انسانوں پر ولایت عطا کی۔ اللہ نے یہ ولایت اس لیے عطا کی تا کہ معاشرہ صلاح وفلاح کی منزل کی طرف گامزن ہو سکے اور انسان کمال فطرت اور کرامت الٰہی کے منازل کو حاصل کر سکیں۔

جب تک انبیاءؑ اوصیاءؑ کا ظاہری سلسلہ قائم رہا تب تک تمام اختیارات انھی کے ہاتھ میں تھے۔ پھر جب غیبت کا سلسلہ شروع ہوا تو امام علیہ السلام نے وہ حق ولایت فقہاء کو عطا کیا اور جب امام علیہ السلام نے ولایتِ فقہاء کا تذکرہ کیا تو اس میں عورتوں کا کوئی ذکر تک نہ کیا۔

عورت کے قاضی بننے کے لیے احادیث میں کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایسی احادیث بھی موجود ہیں جن میں عورتوں کی قضاوت اور حکمرانی کی نفی کی گئی ہے۔ بطور نمونہ حسب ذیل احادیث کا مطالعہ فرمائیں:

① جابر نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی، آپؑ نے فرمایا:

لا تولی المرأة القضاء ولا الامارة

''عورت کو قضاوت اور حکمرانی کا منصب نہیں دیا جائے گا''۔

② حماد بن عمرو کی روایت میں یہ الفاظ مذکور ہیں:

یاعلی! لیس علی المرأة جمعة...... ولا تولی القضاء

''اے علیؑ! عورت پر جمعہ فرض نہیں ہے...... اسے قاضی بھی نہیں بنایا جاسکتا''۔

③ حضرت علی علیہ السلام نے شریح قاضی سے فرمایا تھا: ''شریح! تو اس کرسی

پر بیٹھا ہے جس پر یا تو نبیؐ بیٹھتا ہے یا وصی بیٹھتا ہے یا پھر کوئی شقی (بدبخت) بیٹھتا ہے"۔ (الکافی، جلد ۷/۴۰۶، من لایحضرہ الفقیہ، جلد ۳/۴، المقنع، ص ۱۳۲، تہذیب الاحکام، جلد ۶/۲۱۷)

معلوم ہوتا ہے کہ منصبِ قضا کا اصل حق دار نبی ہوتا ہے یا وصی ہوتا ہے۔ عورت منصبِ قضاوت پر اس لیے فائز نہیں ہوسکتی کہ کسی عورت کو خدا نے نہ تو نبی بنایا ہے اور نہ ہی وصی بنایا ہے۔

④ اسلام کے رہنماؤں کی یہ تعلیم ہے کہ عورت سے مشورہ بھی نہیں لینا چاہیے۔ جب کہ مشورہ کا منصب قضاوت سے کہیں پست ہے۔ جب عورت مشیر نہیں بن سکتی تو وہ جج اور قاضی کے عہدہ پر کیسے فائز ہوسکتی ہے؟

⑤ نہج البلاغہ میں امیر المومنین علی علیہ السلام کا ایک خطبہ مرقوم ہے جس میں آپؑ نے عورتوں کے فطری نقائص کو بیان کیا ہے۔

⑥ نہج البلاغہ میں مرقوم ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو وصیت میں یہ کہا تھا:

وایاك ومشاورۃ النساء...... ان تشتغم بغیرھا (نہج البلاغہ، حصہ مکاتیب مکتوب، ۳۱)

"عورتوں سے ہرگز مشورہ نہ لو کیونکہ ان کی رائے کمزور اور ارادہ سُست ہوتا ہے۔ انھیں پردہ میں بٹھا کر ان کی آنکھوں کو تاک جھانک سے روکو کیونکہ پردہ کی سختی ان کی عزت و آبرو کو برقرار رکھنے والی ہے۔ ان کا گھروں سے نکلنا اس سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتا جتنا کہ کسی ناقابلِ اعتماد کو گھر میں آنے دینا اور اگر بن پڑے تو ایسا کرو کہ وہ تمہارے علاوہ کسی اور کو پہچانتی ہی نہ ہو۔

عورت کو اس کے ذاتی امور کے علاوہ دوسرے اختیارات مت
سونپو کیونکہ عورت ایک پھول ہے وہ کارفرما اور حکمران نہیں ہے۔
اس کا پاس ولحاظ اس کی ذات سے آگے نہ بڑھاؤ اور یہ حوصلہ
پیدا نہ ہونے دو کہ وہ دوسروں کی سفارش کرنے لگے"۔

⑦ صحیحہ ابن خدیجہ میں اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ قضاوت کا عہدہ مرد کے پاس ہونا چاہیے۔ چنانچہ حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں:

انظروا الی رجل منکم یعلم شیئا من قضایانا فانی
قد جعلته قاضیا فتحاکموا الیه (الوسائل، باب صفات
القاضی، جلد ۱۸/۴، حدیث اوّل)

"اس مرد کو دیکھو جو تم میں سے ہے اور وہ ہمارے فیصلوں کو جانتا
ہو تو میں نے اسے قاضی مقرر کیا ہے تم اس سے فیصلہ کراؤ"۔

⑧ ایک اور حدیث صحیح میں یہ الفاظ وارد ہیں:

اجعلوا بینکم رجلا ممن عرف حلالنا وحرامنا فانی
قد جعلته قاضیا (الوسائل، باب وجوب الرجوع فی الفتوٰی
والقضاء الی رواۃ الاحادیث، باب ۱۱، جلد ۸/۱۰۰، حدیث ۶)

"جو مرد تم میں سے ہمارے حلال حرام کو جانتا ہو میں نے اسے
قاضی مقرر کیا ہے"۔

مذکورہ بالا دونوں احادیث میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ قضاوت کا منصب مردوں کے لیے ہے نہ کہ عورتوں کے لیے۔

اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ عورت گھر میں رہ کر اپنے صنفی فرائض سرانجام دے اور مرد گھر سے باہر کے امور کو انجام دے۔ عورت کو چراغ خانہ رہنا چاہیے شمع محفل

نہیں ہونا چاہیے۔

سوال عورت کی معاشرتی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

جواب اس سوال کے جواب کے لیے مستقل رسالہ کی ضرورت ہے۔ جب کہ ہم یہاں چند نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

① قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی منشا یہ ہے کہ عورت کو گھر سے باہر کے کاموں سے دُور رکھا جائے۔ اس کی شرعی ذمہ داری گھر داری ہے۔ وہ اپنے شوہر کی خدمت کرے اور اپنے بچوں کی احسن انداز میں پرورش کرے اور اسے چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کی فکری اور ایمانی تربیت کرے کہ اس کی اولاد مستقبل میں اسلام کا سرمایہ کہلا سکے۔

اور تربیتِ اولاد کا عمل اتنا وسیع ہے کہ عورت کو اس سے باہر کے کاموں کے لیے فرصت ہی نہیں ملتی۔ اسلام میں عورت کو ہر طرح کے انفاق سے آزاد رکھا ہے۔ اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہے۔ عورت اگرچہ صاحبِ جایداد ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ہی عائد ہوتی ہے۔

② نصوصِ شرعیہ کا تقاضا ہے کہ عورت مخلوط اجتماعات سے پرہیز کرے اور اپنے گھر کی دنیا کو آباد رکھے۔ اگر بالفرض عورت کو مجبور ہو کر گھر سے باہر ملازمت کرنی پڑ جائے تو پھر ایسے محکمہ کا انتخاب کرے جہاں مردوں کی آمدورفت نہ ہوتی ہو۔ کسی بھی باایمان عورت کو ہوٹلوں کے استقبالیہ اور سیلز گرل جیسی ملازمتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے روبرو نہ آئیں جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ

"اور جب تم ان سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کی اُوٹ سے طلب کرو"۔ (احزاب:۵۳)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

المرأة ریحانه ولیست بقهرمانة

"عورت ایک پھول ہے وہ کارفرما اور حکمران نہیں ہے"۔

سندی بن محمد نے ابوالبختری سے روایت کی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے: حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے درمیان تقسیم کار کی اور فرمایا: گھر سے باہر کے امور حضرت علیؑ انجام دیں گے اور گھر کے اندرونی کام حضرت فاطمہؑ کریں گی۔

حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں: مجھے اپنے والد کے فیصلہ سے اتنی زیادہ خوشی ہوئی کہ اس کا اندازہ صرف خدا ہی کرسکتا ہے۔ مجھے میرے والد نے مردوں کی محافل میں جانے سے بچالیا تھا۔ (بحار، جلد ۴۳/۸۱ بحوالہ قرب الاسناد)

سر دست ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں جب کہ اس مضمون کی روایات بہت زیادہ ہیں۔

نوجوان لڑکیاں اور یورپی یونیورسٹیاں

سوال کچھ نوجوان لڑکیاں پیرس یا یورپ کی دیگر یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ وہاں انھیں اسلام کے بہت سے احکامات کی مخالفت کرنا پڑتی ہے مثلاً وہ سر پر اسکارف نہیں اوڑھ سکتیں اور میڈیکل کی طالبات کو مُردہ مردوں کا پوسٹ مارٹم کرنا پڑتا ہے اور ہر وقت مُردوں کو ہاتھ لگانا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں انھیں اپنے مرد اساتذہ سے بھی مصافحہ کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں

انھیں دیگر مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اندریں حالات کیا انھیں ایسے ماحول میں تعلیم حاصل کرنا چاہیے؟

جواب یہ طریقہ دانش مندانہ نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ کو مشکلات میں پھنسا کر پھر اسلام سے یہ توقع کریں کہ وہ ہماری مشکل کو ہماری منشا کے مطابق حل کرے۔ اس کے لیے ہمیں ایسے مواقع سے نکلنا ہوگا۔ کیا یہ ضروری ہے کہ نوجوان لڑکیاں پیرس یا لندن یا میونخ ہی میں تعلیم حاصل کریں۔ مغربی ممالک کے بجائے لڑکیاں ایران جیسے اسلامی ملک میں تعلیم حاصل کیوں نہیں کرسکتیں۔

سوال بی بی معصومہ قم کی شادی کیوں نہ ہوئی؟

جواب حضرت سیدہ فاطمہ بنت امام موسیٰ کاظم معصومہ مدفونہ قم کی شادی نہ ہونے کے متعلق ہم یہ گزارش کرتے ہیں:

یعقوبی لکھتے ہیں: امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی وصیت تھی کہ ان کی کسی بیٹی کی شادی نہ کی جائے چنانچہ ایک بیٹی کے علاوہ آپؑ کی کسی بیٹی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ (تاریخ یعقوبی، جلد۲/ ۳۱۵، طبع صادر بیروت)

ہم سمجھتے ہیں کہ یعقوبی کو مغالطہ ہوا ہے۔ امام علیہ السلام نے ایسی کوئی وصیت نہیں کی تھی۔ کلینی لکھتے ہیں: امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے یہ وصیت کی تھی کہ میری بیٹیوں کے نکاح کا اختیار میرے فرزند علی رضاؑ کو ہوگا۔ وہ اپنی قوم کے نکاحوں کو بہتر جانتے ہیں۔ (الکافی، جلد اوّل/ ۳۱۶، عیون اخبار الرضا، جلد اوّل/ ۳۳)

ایک اور وصیت میں آپؑ نے یہ فرمایا تھا: میری جو بھی بیٹی شادی کرے گی اس کا اس صدقہ میں کوئی حصہ نہ ہوگا جسے میں نے فقراء و مساکین کے لیے وقف کیا ہے۔ (عیون اخبار الرضا، جلد اوّل/ ۳۷)

آپؑ کی اس وصیت کی ممکنہ طور پر یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ شادی کے بعد عورت کا

نان ونفقہ اس کے شوہر پر فرض ہو جاتا ہے اسی لیے وہ اس وقف سے حصّہ نہیں لے سکتی جو غرباء و مساکین کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام نے مدینہ منورہ کے دس گاؤں کی آمدنی اپنی غیر شادی شدہ بہنوں اور بیٹیوں کے لیے وقف کی تھی۔ چنانچہ آپؑ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی بیٹیوں کا حصّہ مدینہ سے قُم روانہ کرتے تھے۔ (تاریخ قم، ص ۲۲۱)

معلوم ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام کی وصیت کا اصل مقصد یہ تھا کہ آپؑ کی بیٹیوں کا نکاح ان کے کفو کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اگر کفو کے علاوہ کہیں اور نکاح کر دیا جاتا تو اس سے بہت سی مشکلات جنم لینے کا اندیشہ تھا اور اس سے کچھ لوگ ناجائز استفادہ کرتے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ہارون الرشید نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے کہا تھا کہ آپؑ اپنی بیٹیوں کو ان کے چچازادوں اور ان کے کفو کے ساتھ بیاہ کیوں نہیں دیتے؟

امام علیہ السلام نے اس کے ساتھ اپنی غربت و افلاس کا عذر پیش کیا تھا۔ (عیون اخبار الرضا، جلد اوّل/ ۸۸)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس دور میں ائمہ علیہم السلام ایسے مصائب میں گرفتار تھے کہ ان کے قریبی رشتہ دار بھی ان سے رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھیں ہر وقت یہ فکر رہتی تھی کہ اگر ہم نے ان سے رشتہ داری کی تو ہم بھی حکام کی نظروں میں معتوب قرار پائیں گے۔

منصور دوانیقی کے دور سے ہارون الرشید تک کا دور آلِ محمدؐ کے لیے سخت آزمائش کا دور تھا۔ اس دور کے متعلق مؤرخ خوارزمی نے جامع تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس دور میں شجرِ نبوت کو کاٹا گیا اور امامت کی کھیتی کو اُجاڑا گیا۔

☼☼☼

چوتھا حصّہ

احکامِ شرعیہ

سوال امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف علماء پر فرض ہے یا تمام مسلمانوں پر فرض ہے؟

جواب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف علماء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ وہ ہر مسلمان پر واجب ہے بشرطیکہ اسے شرائط کا علم ہو اور وہ ان شرائط کی پابندی بھی کرسکتا ہو۔ مزید تفصیل کے لیے علماء کے عملیوں کا مطالعہ فرمائیں۔

سوال کیا امر بالمعروف کے لیے کسی کو زدوکوب کرنا جائز ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا اس کے لیے حاکمِ شرعی کی اجازت ضروری ہے؟

جواب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تین مراتب ہیں:

① بُرائی سے نفرت کرنا یا نیکی چھوڑنے والے سے نفرت کرنا۔

② انسان کو چاہیے کہ زبان سے نیکی کا حکم دے اور بُرائی سے منع کرے۔

③ اگر حیثیت ہو تو پھر ہاتھ سے بُرائی کو روکے۔ لیکن پہلے یہ تعیّن کرنا ضروری ہے کہ پہلے دونوں طریقوں سے بُرائی کو نہیں روکا جاسکتا تھا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ زدوکوب اس حد تک نہ ہو کہ فریق ثانی زخمی ہوجائے یا اس کی ہڈی ٹوٹ جائے۔

سوال کیا مجتہد کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی شخص کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے روک دے؟

جواب مجتہد کبھی حاکم اور ولی فقیہ ہوتا ہے اور اگر وہ یہ جان لے کہ فلاں شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ بجالانے سے قاصر ہے تو اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اسے روک دے۔

اگر مجتہد کے پاس حکومت واقتدار نہ ہو اور وہ کسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق رہنمائی کرنا چاہے تو وہ رہنمائی ضرور کرسکتا ہے لیکن اسے اس سے روک نہیں سکتا کیونکہ اسے کسی طرح کا اقتدار میسر نہیں ہوتا۔

اگر ولی فقیہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے ایک جماعت تشکیل دے تو اس صورت میں مکلف کو چاہیے کہ وہ اپنے مرجع کی طرف رجوع کرے۔ اگر مرجع تقلید یہ کہے کہ اس کام کے لیے ایک جماعت مقرر ہو چکی ہے اور دوسروں کی ضرورت نہیں ہے تو مکلف کو چاہیے کہ وہ اپنے مرجع تقلید کے فرمان پر عمل کرے۔ البتہ اگر اس کا مرجع تقلید یہ کہے کہ اس جماعت کے باوجود اس کا وجوب ہر مکلف پر بدستور فرض ہے تو مکلف کو چاہیے کہ وہ اس فریضہ کو انجام دے اور اگر ولی فقیہ اسے منع کردے تو پھر رُک جانا چاہیے۔

اور اگر نہی عن المنکر کا تعلق امور عقائد اور ردِ بدعات اور لوگوں کو شک وشبہ سے بچانے سے ہو تو ولی فقیہ یا کسی دوسرے مجتہد کو اس سے منع کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ولی فقیہ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ولی فقیہ کی بس یہی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کے وجود کی اصلیت اور ان کے نظام کی حفاظت کرے۔ بدعات اور شبہات سے محفوظ رکھنا اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔

سوال کچھ لوگ تجسس جیسے حرام افعال کا ارتکاب کرتے ہیں اور وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اجتماعی مفادات کے تحفظ کے لیے ایسا کر رہے ہیں اور ہمارا یہ فعل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

کے لیے ہے۔ کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

جواب کسی کے خلاف تجسّس کر کے اسے اذیت میں مبتلا کرنا ناجائز ہے اور جو کوئی ایسا کرے وہ بُرائی کا مرتکب ہوگا۔ اسے اس کام سے روک دینا چاہیے۔ ایسا کرنے والا خواہ عالم ہو یا جاہل ہو، تجسّس اصلاح پسند افراد کا فعل نہیں ہے۔

سوال ایک شخص بُرائی کرتا ہے اگر میں یہ سمجھوں کہ میرے قطع تعلق کی وجہ سے وہ شخص بُرائی چھوڑ دے گا تو کیا میرے لیے قطع تعلق کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ اور کیا اس سے زیارتِ مومن کے استحباب کے تقاضوں کی نفی تو لازم نہ آئے گی؟

جواب ہر وہ فعل جائز ہے جس سے یہ توقع ہو کہ اس کی وجہ سے وہ شخص بُرائی سے باز آ جائے گا۔ علماء نے اپنی توضیحات میں اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

دماغ کی موت اور شرعی موت

سوال کیا دماغ کی موت سے شرعی موت ثابت ہو جاتی ہے؟ مثلاً اگر ڈاکٹر کسی مریض کے لیے کہیں کہ اس کا دماغ مر چکا ہے تو کیا اُسے مُردہ سمجھنا صحیح ہے؟

جواب ① دماغ کی موت کو پورے بدن کی موت نہیں سمجھا جا سکتا۔ اہلِ عقل دماغ کی موت کی صورت میں بھی ایسے شخص کو زندہ سمجھتے ہیں۔

② موت کے احکام مکمل بدن کے موت کے بعد ہی شروع ہوتے ہیں۔ صرف دماغ کی موت سے وہ احکام عائد نہیں ہوتے۔ اگر کسی شخص کے دماغ کی موت واقع ہو جائے تو ہمیں اس کا پوسٹ مارٹم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور دماغی موت کے بعد اس کے اعضاء کو کاٹنا بھی جائز نہیں ہے۔ اگر اس شخص نے آنکھوں کے عطیہ کی وصیت کی ہو تو بھی دماغی موت کے بعد اس کی آنکھوں کو نکالنا جائز نہیں ہے۔ اسی

طرح سے دماغی موت کے بعد اسے مُردہ سمجھ کر اس کے ترکہ میں وراثت کا عمل بھی شروع نہیں کیا جاسکتا۔ دماغی موت سے اس شخص کی بیوی کی عدت شروع نہیں ہوگی۔

③ بعض اوقات خدا کی طرف سے معجزات بھی نمودار ہوتے ہیں مثلاً اندھے ٹھیک ہوجاتے ہیں اور مفلوج چلنے پھرنے لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح سے دماغی موت کے بعد دعاؤں اور دواؤں کے اثر سے ایسا شخص ٹھیک بھی ہوسکتا ہے۔ جب تک کسی بھی انسان میں سانس کی آمدورفت کا سلسلہ قائم ہے، اسے مُردہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

اسقاطِ حمل

سوال کیا انعقادِ نطفہ اور چار ماہ کے حمل سے قبل اسقاطِ حمل جائز ہے؟

جواب ہرگز نہیں، ایسا کرنے والے پر اسقاطِ نطفہ کی دیت لازم ہوگی۔ اگر عورت اس پر اصرار کرے تو بھی اس پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔

آگ میں جلانا

سوال بعض لوگ بیان کرتے ہیں کہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے کچھ لوگوں کو آگ میں جلایا تھا جو آپؑ کے متعلق الوہیت کا دعویٰ کرتے تھے۔ جب ابن عباس نے یہ سنا تو اس نے کہا: رسولؐ اللہ کا فرمان ہے کہ آگ کا عذاب صرف آگ کا رب ہی کسی کو دے سکتا ہے۔ اگر حضرت علیؑ نے ایسا کیا ہے تو ان سے غلطی صادر ہوئی ہے۔ اس روایت کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں، وضاحت فرمائیں۔

جواب ① لواطت کرنے والے کے لیے اسلام میں یہ سزا مقرر کی گئی ہے

کہ اسے آگ میں جلا دیا جائے جیسا کہ صحیحہ مالک بن عطیہ اور صحیحہ عزامی میں بیان کیا گیا ہے۔ (الوسائل، جلد ۱۸، باب ۳-۵، من ابواب حد اللواط، حدیث اوّل و چہارم)

اس حکمِ شرعی سے لا یعذب بالنار الا رب النار کی

۲ جب ابن ملجم لعین نے حضرت علی علیہ السلام پر ضرب چلائی اور بعد ازاں گرفتار ہو گیا تو آپؑ نے فرمایا: میرے بعد اس شخص کو وہی سزا دینا جو رسولؐ خدا نے اس شخص کے لیے تجویز کی تھی جو آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ رسولؐ خدا نے اس کے لیے فرمایا تھا: ''اسے قتل کر دو پھر اس کی لاش جلا دو''۔ (مسند احمد بن حنبل، جلد اوّل/۹۳)

ابن شہر آشوب لکھتے ہیں: حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جب یہ ہلاک ہو جائے تو اس کی لاش کے ساتھ وہی سلوک کرو جو قاتل نبی کی لاش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

لوگوں نے عرض کیا کہ آپ اس کی وضاحت کریں۔ آپؑ نے فرمایا: اسے قتل کر کے اس کی لاش کو جلا دیا جائے۔

۳ یہ بھی تو ممکن ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے انھیں رب کہنے والوں کو آگ میں اس لیے جلایا ہو کہ لوگوں کو علم ہو جائے کہ جو بھی انھیں رب کہے تو اس کی سزا یہی ہے۔

۴ اگر لا یعذب بالنار الا رب النار کی روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو ما من عام الا وقد خص کے تحت اس کا استثنائی حصہ یہ ہے کہ جو بھی امیر المومنینؑ کو معبود کہے تو اسے آگ میں جلانا جائز ہے۔

شیخ صدوق اور اذان میں شہادتِ ثالثہ

سوال اذان میں علی ولی اللہ کی گواہی کے لیے شیخ صدوق کی رائے کیا تھی؟

جواب شیخ صدوق رحمہ اللہ نے اذان کے باب میں یہ لکھا ہے:

المفوضة لعنهم الله قد وضعوا اخبارا وزادوا في الاذان "محمد و آل محمد خيرالبرية" مرتين وفي بعض رواياتهم بعد اشهد ان محمدا رسول الله "اشهد ان عليا ولي الله" مرتين: ومنهم من روى بدل ذلك "اشهد ان عليا اميرالمومنين حقا" مرتين ولا شك ان عليا ولي الله وانه اميرالمومنين حقا وان محمد واله خيرالبرية لكن ذلك ليس في اصل الاذان، انما ذكرت ذلك ليوف بهذه الزيادة المتهمون بالتفويض المدسون انفسهم في جملتنا (من لا يحضره الفقیہ، جلد اوّل/۱۸۸، وسائل الشیعہ، جلد ۵/۴۲۲، طبع موسسہ آل البیت)

"خدا گروہ مفوضہ (وہ لوگ جن کا عقیدہ ہے کہ خدا نے محمدؐ وآلِ محمدؐ کو پیدا کیا پھر باقی کائنات کی تخلیق اور رزق کا نظام انہی حضرات کے سپرد کر دیا) پر لعنت کرے جنہوں نے اپنی طرف سے احادیث بنائیں اور اذان میں محمد وآلِ محمد خیرالبریۃ کا اضافہ کیا۔ مفوضہ کی بعض روایات میں اشهد ان محمدا رسول اللہ کے بعد اشهد ان علیا ولی اللہ کو دو مرتبہ پڑھا گیا ہے۔ کچھ مفوضہ وہ ہیں جو اس کے بدلے اشهد ان علیا امیرالمومنین حقا دو مرتبہ اذان میں کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت علیؑ اللہ کے ولی ہیں اور وہ حقیقی امیرالمومنین ہیں اور محمدؐ اور ان کی آلؑ تمام مخلوق سے

افضل ہے لیکن یہ الفاظ اذان کا حصّہ نہیں ہیں"۔

میں نے یہ وضاحت اس لیے کی ہے کہ اس زیادتی کی وجہ سے مفوضہ کی پہچان ہو جائے جو ہمارے ہم عقیدہ نہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ہماری صف کا فرد کہلاتے ہیں۔

① شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ کو دراصل اذان میں شہادتِ ثالثہ کی ادائیگی پر ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انھیں صرف اس بات پر اعتراض تھا کہ جعلی روایات کے ذریعہ سے اسے فصول اذان میں سے ایک فصل قرار دیا صحیح نہیں ہے۔

② شیخ صدوق یہ سمجھتے تھے کہ اس جملہ کو قربت مطلقہ کی نیت سے کہنا چاہیے اور ہمارے دور کے باقی فقہاء کا بھی یہی نظریہ ہے۔ وہ اس جملہ کو جزوِ اذان نہیں مانتے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ جس طرح سے اذان میں شہادتِ رسالت کے بعد درود پڑھنا مستحب ہے۔ (وسائل الشیعہ، طبع مؤسسہ آل البیت، جلد ۵/۴۱۵، الکافی، جلد ۳/۳۰۳، من لایحضرہ الفقیہ، جلد اوّل/۱۸)

اس حقیقت سے ہم سب واقف ہیں کہ اذان میں درود پڑھنا اذان کے کلمات میں سے نہیں ہے۔ شیخ صدوق کو شہادت ثالثہ پر اعتراض نہیں تھا۔ انھیں اگر اعتراض تھا تو صرف روایات پر تھا۔ وہ انھیں صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

اگر بالفرض ہم یہ مان بھی لیں کہ حضرت صدوق اذان میں ولایت کی گواہی کو جائز نہیں سمجھتے تھے تو ہم اس سلسلہ میں یہ گزارش کریں گے کہ ضروری نہیں ہے۔ جن احادیث کو شیخ نے موضوع قرار دیا وہ فی الواقع موضوع ہی ہوں۔ عین ممکن ہے کہ روایات معصومین سے وارد ہوں لیکن شیخ مرحوم کو ان کی صحت کے متعلق تسامح ہوا ہو۔

③ ممکن ہے کہ شیخ صدوق اس طرف متوجہ نہ ہوئے ہوں کہ احادیث کا مقصد اذان میں بدون مقصدِ جزئیت ولایت کی گواہی دینا ہے اور ان احادیث کی وہی

حیثیت ہے جیسا کہ ان احادیث کی ہے جن میں شہادتِ رسالت کے بعد درود پڑھنے کو مستحب کہا گیا ہے جب کہ درود کا تعلق فصولِ اذان سے نہیں ہے۔

④ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کچھ احکام ایسے بھی تھے جن کا ائمہ طاہرینؑ کھل کر اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ یہ معاملہ صرف چند ائمہ تک ہی محدود نہیں تھا۔ حضرت رسولؐ اکرم اور امیر المومنینؑ بھی چند مسائل بیان نہ کر سکے تھے۔ چنانچہ وہ تعلیمات سینہ بہ سینہ آئمہ طاہرینؑ کے پاس محفوظ تھیں پھر جب حالات سازگار ہوئے تو آئمہؑ نے ان حقائق کا اظہار کیا تھا۔

⑤ یہ بات دلائل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند احکام کے نفاذ کو آئمہ کے پاس تفویض کیا۔ جب حالات سازگار ہوئے تو آئمہ اپنے اس خدائی اختیار کو استعمال کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو احکامِ دین تفویض کیے تھے چنانچہ آپؐ نے اس خدائی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے نمازِ ظہر و عصر و عشاء میں آخری دو رکعات کا اضافہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آخری دو رکعات کو رکعاتِ سنت اور پہلی دو رکعات کو رکعاتِ فریضہ کہا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ شہادتِ ثالثہ فی الاذان کا معاملہ بھی یہی ہو۔ ائمہ کا دور انتہائی مشکل دور تھا اور اس زمانے میں شیعیت انتہائی مشکلات سے گزر رہی تھی۔ ان ایام میں یہ ممکن نہ تھا کہ ائمہ اپنے پیروکاروں کو اذان میں شہادتِ ثالثہ کا حکم جاری کرتے۔

ائمہ کے دور کے بعد جب ان کی روایات منظرِ عام پر آئیں تو اذان میں شہادتِ ثالثہ شروع کر دی گئی اور انھی روایات کی بنیاد پر بعض فقہائے ملّت نے شہادتِ ثالثہ کو جزوِ اذان قرار دیا۔ لہٰذا اگر حضرت شیخ صدوق اس خصوصیت کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تو اس سے شہادتِ ثالثہ کے جواز میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہم اپنے الفاظ کو پھر دوبارہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت صدوق شہادتِ ثالثہ فی الاذان کے منکر نہیں تھے۔ اس کی بجائے وہ ان روایات کے منکر تھے جن میں شہادتِ ثالثہ کو جزوِ اذان کہا گیا ہے۔ انھیں اس جملہ پر بدون قصد جزئیت کوئی اعتراض نہیں تھا جیسا کہ ہمارے اکثر فقہاء کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لیے ہماری کتاب "مخلفیات ما ساۃ الزہراء" جلد۲/ ۴۳۸ تا ۴۴۴ کی طرف رجوع فرمائیں۔

کیا غمِ حسینؑ میں ماتم کی روایات بھی منقول ہیں

سوال جناب عالی! عام ایام میں بالعموم اور روزِ عاشورا بالخصوص حضرت امام حسین علیہ السلام کی عزاداری منعقد کی جاتی ہے اور اس میں سینہ اور چہرے پر ماتم کیا جاتا ہے۔ اہلِ سنت بھائی ہم پر اعتراض کرتے ہیں کیا آلِ محمدؐ کی احادیث میں ماتم کرنے کا کوئی حکم موجود ہے؟

جواب منہ اور سینہ کو پیٹنا بذاتِ خود مستحب نہیں ہے۔ البتہ یہ امر اس وقت محبوب و مطلوب ہوتا ہے جب مقصد امور اہلِ بیتؑ کا اِحیا ہو یا اس سے غمِ حسینؑ کا اظہار مقصود ہو۔

(اصل بات یہ ہے کہ مودت فی القربیٰ اجر رسالت ہے اور یہ امور اسی مودت کا مظہر ہیں)۔

ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے ماتم کرنے یا نہ کرنے کی روایات موجود نہیں ہیں۔ ائمہ طاہرینؑ کی احادیث میں آلِ محمدؐ کے مصائب پر رونے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے مصائب پر حزن و جزع کا حکم ہے اور ان کے امر کو زندہ کرنے کی خصوصی تاکید کی گئی ہے۔

قرآنی آیات اور نمازِ قصر

سوال جناب عالی! حالتِ سفر میں چار رکعتی نماز قصر ہوجاتی ہے اور قصر کے اثبات کے لیے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی جاتی ہے:

وَ إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (النساء:۱۰۱)

''اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ اپنی نماز کو قصر کرلو''۔

آیتِ مجیدہ میں لفظ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کے الفاظ وارد ہیں جس کا معنی ہے کہ تمھارے لیے کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سے نمازِ قصر کا جواز ضرور ثابت ہے لیکن اس کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ وضاحت فرما کر مطمئن فرمائیں۔

جواب جب حضرت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکمِ الٰہی کے تحت مسلمانوں کو نمازِ قصر کا حکم دیا تو یہ بات بہت سے لوگوں پر گراں گزری اور انھوں نے کہا کہ ہائے سفر سے تو ہمیں دینی نقصان پہنچتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری عبادت نصف ہوگئی ہے اور اس طرح سے تو ہم اپنے خدا کے حضور قصوروار قرار پائیں گے۔

کچھ لوگوں نے یہ تہیہ کیا کہ ہم آئندہ سفر ہی نہیں کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دی اور یہ آیت نازل فرمائی کہ جب تم سفر کرنے لگو تو تمھارے لیے نمازِ قصر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان الفاظ سے مسلمانوں کو یہ بات سمجھائی گئی کہ نمازِ قصر میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بعینہٖ اسی طرح کا واقعہ حج وعمرہ کے دوران بھی پیش آیا۔ فتح مکہ سے قبل جب

مسلمان حج وعمرہ کے لیے مکہ آئے تو مشرکینِ عرب نے صفا ومروہ میں بت رکھ دیئے۔ بتوں کو دیکھ کر مسلمانوں کو بڑی کوفت ہوئی اور سوچنے لگے کہ ہم صفا ومروہ میں سعی کیونکر کریں یہاں تو بت رکھے ہیں۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

إِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِاعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا (البقرہ:۱۵۸)

"صفا ومروہ خدا کی یادگاریں ہیں جو کوئی حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان کا طواف کرے"۔

یہاں بھی فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ (کوئی حرج نہیں ہے) کے الفاظ وارد ہیں مگر اس کے باوجود (صفا ومروہ میں) سعی کرنا حج وعمرہ کا رکن ہے۔

تقلید

سوال کیا حضرت سید علی خامنہ ای کی تقلید سے شرعی ذمہ داری پوری ہوجائے گی؟

جواب جہاں تک آیت اللہ سید خامنہ ای کی تمجید کا مسئلہ ہے تو ہماری عادت یہ ہے کہ ہم امر تقلید اور اعلمیت کی گواہی کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتے۔ ہمارے بہت سے احباب ہماری اس روش سے باخبر ہیں۔

ہم سائل کی توجہ قُم کے حوزہ علمیہ کے جامعہ مدرسین کے اس سرکلر کی طرف مبذول کراتے ہیں جو چند سال پہلے جاری کیا گیا تھا۔ اس میں مراجع تقلید علماء کے نام بیان کیے گئے تھے اور سید علی خامنہ ای کا نام بھی اس میں شامل تھا۔

❁❁❁

پانچواں حصّہ

حضرت خاتونِ جنت سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا

مقامِ فاطمہ زہرا علیہا السلام

سوال حضرت سیدہ زہرا سلام اللہ علیہا ایک عظیم مقام کی حامل ہیں۔ سیدہ کے مقام کے حدود بیان فرمائیں اور یہ بھی واضح کریں کہ آیا حضرت سیدہؑ کچھ آئمہ سے افضل ہیں یا تمام آئمہ سے افضل ہیں؟ یا آئمہ کا مقام حضرت سیدہؑ سے بلند ہے؟

جواب حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کے مقام کی معرفت ہماری استطاعت سے باہر ہے اور ہم آپؑ کے مراتب عالیہ کے حدود کو بھی نہیں جانتے۔ اسی لیے ضرورت ہے کہ ان ذواتِ طاہرہ کی طرف رجوع کیا جائے جو خدا کے نمائندے ہیں اور وہ آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔ ذیل میں معصومین کی زبانی ہم عظمتِ سیدہؑ کی چند روایات نقل کرتے ہیں:

① ابوبصیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ”جنابِ سیدہؑ جنات، انسان، پرندوں اور وحوش اور انبیاءؑ و ملائکہ کے لیے واجب الاطاعت تھیں“۔

① امام ابوجعفر ثانی فرماتے ہیں: ”اللہ ازل سے اپنی وحدانیت میں منفرد تھا۔ پھر اس نے محمدؐ، علیؑ اور فاطمہ سلام اللہ علیہم اجمعین کو پیدا کیا۔ وہ ایک ہزار زمانہ تک رہائش پذیر رہے۔ پھر اللہ نے تمام اشیاء کو پیدا کیا اور انھیں ان کی خلقت کا گواہ مقرر

کیا اور ان کی اطاعت ان تمام اشیاء پر واجب فرمائی۔

③ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے: "اگر اللہ نے امیر المومنین علیہ السلام کو پیدا نہ کیا ہوتا تو آدمؑ سے لے کر آخر تک کوئی بھی فاطمہ زہراءؑ کا کفو نہ ہوتا"۔

④ بہت سی ایسی احادیث مروی ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے حضرت رسولؐ خدا، بی بی فاطمہ زہراءؑ اور حضرت علیؑ اور حسنین کریمینؑ کو تمام مخلوق سے پہلے پیدا کیا اور اگر وہ نہ ہوتے تو خدا جنت و دوزخ، عرش و کرسی، زمین و آسمان، ملائکہ اور جن وانس کو پیدا نہ کرتا۔

⑤ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ساقِ عرش پر یہ کلمات لکھے ہوئے ہیں: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی و فاطمة والحسن والحسین خیر خلق اللہ۔

⑥ حدیثِ کسا میں وارد ہے کہ جب پنج تن چادر میں جمع ہوئے تو اللہ نے فرمایا: میں نے آسمان و زمین، چاند سورج اور افلاک وسمندر، فاطمہ اور ان کے والد اور ان کے شوہر اور ان کے فرزندوں کی محبت میں پیدا کیے ہیں۔

حدیث کسا کے بہت سے مصادر ہیں جنھیں میں نے حضرت خاتونِ جنت کا اگر کوئی ہم پلہ ہے تو وہ صرف حضرت علی علیہ السلام ہی ہیں۔ حضرت سیدہؑ کا مقام انبیائے ماسلف سے بلند و برتر ہے۔ البتہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؑ سے افضل ہیں اور آپؑ کے خاوند نفسِ رسولؐ ہونے کی وجہ سے آپؑ سے افضل ہیں۔

روایات بیان کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کو محبتِ پنجتن میں پیدا کیا۔

حاصل بحث یہ ہے کہ حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا اپنے والد اور اپنے شوہر علیہما

السلام کے بعد تمام بندگانِ خدا سے افضل ہیں۔

تخلیق زہرا (سلام اللہ علیہا) کی حکمت

سوال حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی تخلیق کا کیا مقصد تھا جب کہ آپؑ نہ تو رسول تھیں اور نہ ہی آپؑ نے امامت کی ذمہ داریاں نبھائی تھیں۔ اس کے باوجود آپؑ کی عصمت کا عقیدہ رکھنا کیوں ضروری ہے؟

علاوہ ازیں یہ واضح کریں کہ اس حدیث کا کیا مطلب ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو کائنات میں فاطمہؑ کا کوئی کفو ہی نہ ہوتا؟

جواب کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بڑا انسان صرف وہی ہے جو سیاست میں اہم کردار ادا کرے اور اپنی تقاریر وخطبات سے ایک جہان کو متاثر کرے اور اگر کسی کو یہ مقام حاصل نہ ہو تو اسے غیر اہم شخصیت سمجھا جاتا ہے۔

اگر کسی شخص کی اہمیت کا یہی پیمانہ اور یہی معیار ہے تو پھر آئمہ کی امامت ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گی اور ان کی شخصیت کی تقدیس تو کجا ان کی شخصیت کی افادیت ہی مشکوک ہو جائے گی۔ اور کسی کی بھی شخصیت کو پرکھنے کا یہ انداز بالکل غیر صحیح ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے ستاون برس کی عمر پائی تھی۔

اس تمام عرصہ میں ہنگامہ خیز لمحات کا تعلق صرف روزِ عاشورا کے واقعات سے ہے۔ اس طرزِ تفکر کے حامل افراد کی نظر میں امام حسن علیہ السلام کی زندگی کا کارنامہ ان کی صلح پر تمام ہو جاتا ہے اور حضرتؑ کے بعد کی زندگی کی ان لوگوں کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

ایسے ہی افراد کی نظر میں حضرت امام سجاد علیہ السلام کا صرف کارنامہ یہی ہے

کہ آپؑ نے چند پُر اثر دعائیں تخلیق کی تھیں۔ اس طرزِ تفکر کے حامل افراد کی نظر میں حضرت امام محمد تقیؑ، حضرت امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکری علیہم السلام کی زندگی بالکل بے مقصد اور بے فائدہ ہے۔ کیونکہ ان آئمہؑ کی زندگی میں کوئی ہنگامہ خیز لمحات دکھائی نہیں دیتے۔

ایسے افراد کی نظر میں امامِ زمانہؑ کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔ البتہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ظہور کے بعد وہ کچھ موٴثر کردار ادا کریں گے ورنہ عرصۂ غیبت میں ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔

اگر طرزِ تفکر یہی ہے تو پھر اسلام پر سلام ہوں۔ اس طرزِ تفکر سے ابلیس کو خوشی محسوس ہوتی ہے اور ابلیس ان لوگوں کا شکر گزار ہے کہ دین کی عمارت کو منہدم کرنے میں انھوں نے ابلیس کی مدد کی ہے۔

اس طرزِ تفکر کے برخلاف ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی بھی شخص کی حیثیت کو ماپنے کا ذریعہ یہ ہے کہ اس کے ذمہ جو ڈیوٹی عائد ہوئی ہے وہ اس کے لیے پہلے سے کتنی تیاری اور آمادگی رکھتا ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے روزِ عاشورا دینِ خداوندی کو بچایا۔ آپؑ نے کارنامہ اگرچہ اپنی ظاہری زندگی کے آخری دن میں سرانجام دیا تھا لیکن اس کے لیے آپؑ نے ستاون برس تک تیاری کی تھی تب کہیں یہ محیر العقول واقعہ سرانجام پایا تھا۔

اس طرح سے باقی ائمہؑ نے برس ہا برس تک تیاری کی تا کہ وقت آنے پر دینِ الٰہی اور شریعت محمدی کو دستِ تحریف سے محفوظ رکھیں۔

حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا نے اپنے دور میں اہم کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ آپؑ نے وفاتِ رسولؐ کے بعد لوگوں کو جعلی امامت سے بچانے اور حقیقی امامت کی معرفی میں اہم کردار ادا کیا تھا اور اس زمانہ میں حضرت سیدہؑ نے جو کردار ادا کیا تھا ایسا کردار

کسی اور سے ممکن نہیں تھا۔

۱ آپؑ نے حضرت علیؑ کے سیاسی مخالفین کے ظلم و ستم کو بے نقاب کیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے آپؑ نے اپنے اُوپر ہونے والے ظلم و ستم کی پرواہ تک نہیں کی تھی۔

۲ حضرت سیدہؑ نے سقیفائی حکومت کی نااہلی کو واضح کیا۔ آپؑ نے عملی طور پر ثابت کیا کہ مدعیانِ حکومت اس امانت کے اہل نہیں ہیں۔

آپؑ نے مطالبہ میراث و فدک کے وقت طویل ترین خطبہ دیا۔ جس میں آپؑ نے سقیفائی حکومت کے اقدامات کو اسلامی بدیہیات کے خلاف قرار دیا اور فرمایا کہ ان کا یہ فیصلہ قرآن کریم کی نصوصِ وراثت کے سراسر خلاف ہے۔

آپؑ نے یہ واضح کیا کہ جب سقیفائی حکومت اسلام کے بدیہی احکام سے بے خبر ہے تو اسلام کے دوسرے احکام سے ان کی واقفیت کیا ہو سکتی ہے۔ اور اگر بالفرض اربابِ سقیفہ شرعی مسئلہ سے آگاہ تھے تو انھوں نے آپ کو حق میراث سے محروم کر کے ظلم و زیادتی کی ہے۔ اور بی بیؑ کی زبان مظلومیت نے ہر باضمیر کو پکار کر کہا: جو لوگ رسولِؐ اسلام کی بیٹی سے انصاف نہیں کر سکتے تو وہ اُمت رسولؐ سے کیا انصاف کریں گے؟!

حضرت سیدہؑ نے اپنی مظلومیت کے ذریعہ سے اُمت اسلامیہ کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر ان سے یہ سوال کیا کہ جو لوگ بنتِ پیغمبرؐ سے انصاف نہ کر سکتے ہوں وہ اُمت کی رہنمائی کیا کریں گے اور اُمت سے بالاتر ہو کر تمام انسانوں کی ہدایت کیا کریں گے۔

اتنے بڑے فکری جہاد کے لیے عصمت کا ہونا ضروری تھا کیونکہ اگر یہ تحریک کسی غیر معصوم کی طرف سے چلائی گئی ہوتی تو پھر لوگ سوچتے کہ دونوں فریق غیر معصوم ہیں۔ ممکن ہے کہ حکومتی فریق حق پر ہو۔

یہاں تک تو ہم نے حضرت سیدہؑ کے ظاہری کردار کا تذکرہ کیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر معصومؑ کے وجود میں کچھ نہ کچھ الٰہی اسرار مضمر ہوتے ہیں اور حضرت سیدہؑ بھی سرِ الٰہی کی امین تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لیے کچھ کامل عملی نمونے مقرر کیے۔ انبیائے کرامؑ ایمان باللہ اور سیرتِ طیبہ کے کامل نمونے تھے اور حضرت خاتم الانبیاءؐ تمام انسانوں کے لیے اسوۂ کامل کی حیثیت رکھتے تھے۔

ادھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانیت کو صنفی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک صنف مردوں پر مشتمل ہے اور دوسری صنف عورتوں پر مشتمل ہے۔ تمام انبیاءؑ کرام کا تعلق مردوں کی صنف سے تھا، اسی لیے ضروری تھا کہ خواتین میں بھی ایسے کامل نمونے ہونے چاہییں جو خواتین کو زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کرسکیں۔

خواتین کی دنیا میں حضرت حواؑ، حضرت ہاجرہؑ، حضرت سارہؑ، حضرت آسیہ زوجۂ فرعون اور حضرت مریمؑ کو اہم مقام حاصل ہے۔ لیکن جس طرح سے حبیبِ خدا اسوۂ کامل تھے اسی طرح سے عالمِ نسواں میں اگر کوئی اسوۂ کامل دکھائی دیتا ہے تو وہ حضرت خاتونِ جنت سلام اللہ علیہا کی ذاتِ مبارکہ ہے۔

ہر عورت کی زندگی میں تین موڑ آتے ہیں:

① پہلا دَور وہ ہے جب وہ کسی کی بیٹی ہوتی ہے۔

② دوسرا دَور تب شروع ہوتا ہے جب وہ کسی کی بیوی بنتی ہے۔

③ تیسرا دَور وہ ہے جب وہ ماں بنتی ہے۔

مذکورہ تینوں ادوار میں اگر عالمِ نسواں کے لیے کوئی بی بی اسوۂ کامل کہلا سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہیں۔ آپؑ نے بیٹیوں کے لیے روشن مثالیں قائم کی تھیں۔ آپؑ نے بیوی بن کر عالمِ اسلام کی ہر بیوی کے لیے

ارفع و اعلیٰ اقدار قائم کی تھیں اور آپؑ نے ماں بن کر اولاد کی جو تربیت کی، اس سے آپؑ نے ہر مخدرۂ اسلام کے لیے روشن راہیں متعین فرمائی تھیں۔

علامہ اقبال نے خواتینِ اسلام سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہا تھا:

اگر پندے ز درویشی پذیری
ہزار امت بمیرد تو نمیری
بتولی باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیری بگیری

(اضافۃ من المترجم)

مقامِ زہراؑ اور اسقاطِ جنین

سوال جنابِ عالی! بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت سیدہؑ نے اپنی میراث اور ہبہ فدک کا مقدمہ خلیفۂ اوّل کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے بی بی کے دلائل کو تسلیم کیا اور بی بی کی جائیداد واگزار کرنے کے لیے ایک وثیقہ لکھ دیا۔ بی بی وہ وثیقہ لے کر گھر آرہی تھیں کہ راستے میں حضرت علیؑ کا ایک سیاسی حریف ملا۔ اس نے بی بی سے وہ وثیقہ بزور چھین لیا۔ اس دوران بی بی نے مزاحمت کی۔ اس نے آپ کو دھکا دیا اور وہ وثیقہ چھین لیا اور اس کے پرزے پرزے کر دیے۔ زمین پر گرنے کی وجہ سے آپؑ کے شکم پر چوٹ آئی۔ آپؑ حاملہ تھیں اور آپؑ کے حمل کا اسقاط ہو گیا۔

اسقاطِ جنین کے لیے ایک روایت پیش کی جاتی ہے کہ اربابِ حکومت نے سیدہؑ کے دروازے کو آگ لگائی اور جلتا ہوا دروازہ

آپؑ کے وجودِ اطہر پر گرا جس کی وجہ سے آپؑ کا حمل ضائع ہوگیا۔

دونوں روایات میں خاصا تضاد پایا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کی اصل حقیقت کیا ہے؟

جواب اسقاطِ جنین کی زیادہ تر روایات کے متعلق دروازۂ عصمت کو نذرِ آتش کرنے سے ہے اور جس روایت کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ روایت بھی بعض کتابوں میں مذکور ہے۔ ممکن ہے کہ گھر کے حملہ میں بی بی کو کافی چوٹ آئی ہو اور اسقاط بعد میں ہوا ہو۔ ویسے زیادہ تر روایات کا اشارہ دروازۂ عصمت کے گرنے کی طرف ہے۔

حضرت زہراؑ کی ذات میں کون سا راز مضمر ہے؟

سوال جناب عالی! ایک دعا میں ہم یہ الفاظ پڑھتے ہیں:

اللھم اسئلك بحق الزهراء وابيها وبعلها وبنيها والسر والمستودع فيها

"خدایا! میں تجھے جنابِ زہراؑ اور ان کے والد اور ان کے خاوند اور ان کے بیٹوں کے حق کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں اور میں اس راز کا واسطہ دیتا ہوں جو خاتونِ جنت میں ودیعت کیا گیا ہے۔

وہ کون سا راز ہے جو حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا میں ودیعت کیا گیا تھا؟

جواب جب دعا کے الفاظ ہی یہی ہیں کہ میں تجھے اس راز کا واسطہ دیتا ہوں جو حضرت سیدہؑ کی ذات میں ودیعت کیا گیا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کی ذات والاصفات میں کوئی اہم راز ودیعت کیا گیا ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ وہ راز امامت کا راز تھا یعنی آپ کو اُم الائمہ

ہونے کا شرف دیا گیا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں: آپ مفترض الطاعت تھیں اور حد یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ آپ باقی ائمہؑ پر بھی حجت تھیں۔

لیکن مذکورہ بالا دونوں تاویلات کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ جب کہ اس کے لیے کوئی خاص دلیل موجود نہیں ہے۔ اس لیے سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ ہم اپنے علم کی کمی کا اعتراف کریں اور یہ کہیں کہ ہمیں اس راز سے آگاہی حاصل نہیں ہے۔ ویسے بھی راز اسے کہا جاتا ہے جو پوشیدہ ہو اور ہر شخص اس سے واقف نہ ہو۔ لہٰذا راز کو راز ہی رہنے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

حضرت عثمان کی دامادی پر ایک نظر

سوال کیا حضرت عثمان کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دامادی کا شرف حاصل ہوا تھا جب کہ نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں یہ الفاظ موجود ہیں:

وقد خلت من صهره ما لم ينالا (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶۴)

"تمہیں رسولِ خدا کی دامادی کا شرف حاصل ہے جو کہ شیخین کو حاصل نہیں تھا"۔ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

جواب جس دامادی پر بڑا فخر کیا جاتا ہے وہ دامادی ثابت نہیں ہے کیونکہ رقیہ و اُم کلثوم حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صلبی بیٹیاں نہیں تھیں وہ آنحضرتؐ کی ربیبہ یعنی لے پالک تھیں۔ ان کے متعلق کتب تاریخ میں تین قسم کے اقوال پائے جاتے ہیں:

۱۔ وہ حضرت رسولِ خدا کی صاحب زادیاں تھیں۔

۲۔ وہ حضرت خدیجہؑ بنت خویلد کے پہلے شوہر کی بیٹیاں تھیں۔ جب حضرت خدیجہؑ کا رسولِ خدا سے عقد ہوا تو وہ بچیاں اپنی والدہ کے ہمراہ آنحضرتؐ کے گھر منتقل

ہوگئی تھیں اور ان کی پرورش آنحضرتؐ کے گھر میں ہوئی اور یوں وہ آنحضرتؐ کی بیٹیاں مشہور ہوگئیں۔

۳ یہ بچیاں حضرت خدیجہؑ کی ایک بہن "ہالہ" کی بیٹیاں تھیں۔ ہالہ اور اس کے شوہر کی وفات ہوگئی۔ حضرت خدیجہؑ نے اپنی بھانجیوں کو گود میں لے لیا اور پھر جب بی بی کا نکاح رسولؐ خدا سے ہوا تو یہ بچیاں اپنی خالہ حضرت خدیجہؑ کے ساتھ رسول کریمؐ کے گھر میں آگئیں اور آنحضرتؐ کے گھر میں وہ پلتی رہی تھیں۔ اسی لیے وہ آنحضرت کی بیٹیاں مشہور ہوگئی تھیں۔

اموی حکام نے حضرت عثمان کو دامادِ رسولؐ ثابت کرنے کے لیے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے اور یہ روایات وضع کرائی تھیں کہ وہ آنحضرت کی صلبی بیٹیاں تھیں۔

اس طرح سے اموی حکام یہ چاہتے تھے کہ وہ لوگوں کو یہ باور کرائیں کہ حضرت علیؑ ہی رسول اکرمؐ کے داماد نہیں ہیں ان کے ساتھ ساتھ حضرت عثمان بھی دامادِ رسولؐ ہیں۔ اور اس پروپیگنڈے سے بنی اُمیہ نے لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ حضرت علیؑ کے گھر رسولؐ خدا کی ایک صاحب زادی بیاہی گئی تھی جبکہ حضرت عثمان نے یکے بعد دیگرے رسولؐ خدا کی دو صاحب زادیوں سے نکاح کیا تھا۔ اور اس رشتہ کو حضرت عثمان کی فضیلت کا سبب بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ دونوں لڑکیاں رسولؐ خدا کی صلبی بیٹیاں نہیں تھیں اور اگر بفرض محال انھیں صلبی صاحب زادیاں مان بھی لیا جائے تو بھی اس سے قبل ان لڑکیوں کا نکاح ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے ہوا تھا۔ اگر عتبہ وعتیبہ کو اس دامادی سے کوئی شرف حاصل نہیں ہوا تو حضرت عثمان کو بھی اس سے کوئی شرف حاصل نہیں ہوسکتا۔

مذکورہ مزعومہ بیٹیوں کا تاریخ وحدیث وسیر میں کوئی کردار نہیں پایا جاتا۔ ویسے بھی ان لڑکیوں کا آنحضرت کی صلبی بیٹیاں ہونا محلِ نظر ہے۔ چنانچہ ابوالقاسم الکوفی

(المتوفی ۳۵۲) تحریر فرماتے ہیں:

فلما تزوج رسول الله صلی الله علیه وسلم بخدیجة ماتت هالة بعد ذٰلك بمدة یسیرة وخلفت الطفلتین زینب و رقیة فی حجر رسول اللّٰه (ص) و حجر خدیجة فربیاهما وکان من سنة العرب فی الجاهلیة من یزی یتیما ینسب ذٰلك الیتیم الیه (الاستغاثہ،ص۶۹)

"جب رسولؐ خدا نے حضرت خدیجہؓ سے عقد کیا تو اس کے تھوڑے عرصہ بعد ہالہ کا انتقال ہوگیا اور اس نے دو لڑکیاں چھوڑیں: ایک کا نام زینب اور دوسری کا نام رقیہ تھا۔ انھوں نے رسولؐ خدا اور خدیجہؓ کی گود میں پرورش پائی اور اسلام سے قبل یہ دستور تھا کہ اگر کوئی یتیم بچہ کسی کی گود میں پرورش پاتا تھا تو اسے اس کی طرف منسوب کیا جاتا تھا"۔

اور ابن ہشام نے حضرت خدیجہؓ کی اولاد کے متعلق یہ لکھا:

وکانت قبله عند ابی هالة ابن مالك فولدت له هند بن ابی هالة وزینب بنت ابی هالة وکانت قبل ابی هالة عند عتیق بن عائد بن عبداللّٰه بن عمر بن مخزوم فولدت له عبداللّٰه وجاریة

"حضرت خدیجہؓ رسولؐ خدا کے نکاح میں آنے سے پہلے ابی ہالہ بن مالک کی زوجیت میں تھیں جس سے ایک لڑکا ہند اور ایک لڑکی زینب پیدا ہوئی اور ابی ہالہ سے قبل عتیق بن عائذ کے عقد میں تھیں جس سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی"۔ (سیرت

ابن ہشام، جلد۴/۲۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خدیجہؑ کی دو لڑکیاں عقدِ رسولؐ میں آنے سے پہلے موجود تھیں اور انھوں نے آنحضرتؐ کے گھر پرورش پائی تھی اور وہ عرب دستور کے تحت آپ کی بیٹیاں مشہور ہوگئیں اور وہ جن سے بیاہی گئیں وہ آنحضرتؐ کے داماد کہلائے لیکن دامادی کی حیثیت وہی ہوگی جو ان لڑکیوں کے بیٹی ہونے کی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اسے محلِ افتخار میں پیش کرنے سے پہلے ان بیٹیوں کی حیثیت کو دیکھ لینا چاہیے اور اس کے ساتھ حضرت عثمان کے ''حسنِ سلوک'' کو بھی دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ امام بخاری اپنی صحیح میں یہ روایت درج کرتے ہیں:

عن انس بن مالك قال شهدنا بنت رسول الله والرسول جالس على القبر فرأيت عينيه تدمعان فقال هل فيكم من احد لم يقارف الليلة فقال ابوطلحة انا قال فانزل في قبرها فنزل في قبرها

(صحیح بخاری، جلد اوّل/۲۳۲)

''انس بن مالک کا بیان ہے کہ ہم دخترِ رسولؐ کے دفن کے موقع پر موجود تھے۔ میں نے دیکھا کہ رسولِ خدا قبر پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جو آج کی رات ہم بستر نہ ہوا ہو؟ ابوطلحہ نے کہا: میں۔ حضرتؐ نے فرمایا: پھر تم قبر میں اُترو، چنانچہ وہ قبر میں اُترے''۔

اس موقع پر رسولِ خدا نے حضرت عثمان کے ''راز درونِ پردہ'' کو بے نقاب کرکے انھیں قبر میں اُترنے سے روک دیا حالانکہ آپ کی سیرت کا یہ نمایاں پہلو تھا کہ

آپ کسی کے اندرونی حالات ظاہر کر کے اس کی ہتک اور اہانت گوارا نہ کرتے تھے۔ آپ لوگوں کے عیوب جان کر بھی چشم پوشی کیا کرتے تھے مگر یہاں کردار اتنا گھناؤنا تھا کہ بھرے مجمع میں انھیں شرمندہ کرنا ضروری سمجھا گیا۔

یہاں پر ایک نکتہ انتہائی قابلِ توجہ ہے کہ جب پہلی بیوی سے حضرت عثمان نے وہ حسنِ سلوک کیا تھا کہ رسولِؐ خدا نے بھرے مجمع انھیں شرمندہ کیا تھا تو پھر اس کے بعد دوسری بیٹی کا رشتہ دینے کی کیا تک رہ جاتی ہے؟

آیئے اس مسئلہ کا ایک اور رُخ سے جائزہ لیں۔ مؤرخین نے لکھا کہ اعلانِ نبوت سے آنحضرتؐ نے رقیہ واُم کلثوم کا عقد ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے کیا تھا۔ پھر جب آپؐ نے اعلانِ نبوت کیا اور ابولہب نے آپؐ کی شدید مخالفت کی تو اللہ نے اس کی مذمت میں سورۂ لہب نازل فرمائی۔

ابولہب کو اس پر سخت غصہ آیا۔ اس نے اپنے بیٹوں سے کہا: تمھارا سسر محمدؐ میرے خلاف سورت بنا کر لوگوں کو سنا رہا ہے۔ اس بے عزتی کا بدلہ لینے کا ایک طریقہ ہے کہ تم اس کی بیٹیوں کو طلاق دو۔

چنانچہ عتبہ اور عتیبہ نے دخترانِ رسولؐ کو طلاق جاری کر دی۔ دونوں صاحب زادیاں اپنے والد ماجد کے گھر آ گئیں۔ اس کے بعد رسولِؐ خدا نے رقیہ کا عقد حضرت عثمان سے کر دیا۔ جب حضرت عثمان نے ہجرتِ حبشہ کی تھی تو وہ بیوی ان کے ہمراہ تھی۔ پھر حضرت عثمان مدینہ آئے تو بیوی ہمراہ تھی۔ ۲ ہجری میں اس بیوی کی وفات واقع ہوئی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلی بیوی حضرت عثمان کے پاس کم و بیش پندرہ برس تک ساتھ رہیں۔ پندرہ برس کی طویل رفاقت کے بعد ان کی وفات ہوئی تو رسولِؐ خدا نے اپنی دوسری بیٹی اُم کلثوم ان کے نکاح میں دے دی۔

تمام غیور اور باحیا مسلمانوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر ذرا یہ غور تو کریں کہ جب ابولہب کے بیٹوں نے طلاق دی تھی تو دونوں لڑکیاں جوان اور مدخولہ تھیں۔ ایک لڑکی کی تو شادی ہوگئی۔ دوسری بیٹی کو رسولؐ خدا نے نعوذ باللہ شریعت اور انسانی غیرت کے تمام تقاضوں کو پس پشت ڈال دیا تھا اور پورے پندرہ برس تک اس انتظار میں جوان جہان بیٹی کو گھر میں بٹھائے رکھا کہ اس کی بہن مرے گی تو میں اپنے داماد کو دوسری بیٹی بیاہوں گا؟!!

کیا رسولؐ خدا کو کوئی رشتہ پندرہ سال تک نہیں ملا تھا کہ جس سے آپؐ اپنی صاحب زادی کا نکاح کرتے؟ کیا سابقین اولین صحابہ میں سے کوئی اس قابل نہ تھا کہ اس سے آنحضرتؐ کی بیٹی کا عقد کرتے؟

تاریخ بیان کرتی ہے کہ شیخین نے باری باری رسولؐ خدا کو حضرت فاطمہ زہراؑ کے رشتہ کا پیغام بھیجا تھا لیکن آنحضرتؐ نے یہ کہہ کر مسترد کیا کہ اس کا اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے۔

عجیب بات ہے کہ کم سن بیٹی کے لیے تو شیخین نے خواستگاری کی تھی لیکن ایک جوان لڑکی پورے پندرہ برس تک باپ کے گھر بیٹھی بڑھی ہوتی رہی لیکن کسی طرف سے بھی رشتہ طلب نہیں کیا تھا!!

معلوم ہوتا ہے کہ بنی اُمیہ کی نوازشات پر پلنے والے مؤرخین نے یہ داستان تخلیق کی ہے اور حضرت عثمان کو دوہرا داماد ثابت کرنے کے لیے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اس سے رسولؐ خدا کی اہانت لازم آتی ہے لیکن مؤرخین کی بلا سے حبیبؐ خدا کی توہین ہوتی ہے تو ہوتی رہے لیکن خلیفہ کو دوہری دامادی کا سہرا ضرور باندھا جائے!!

بناتِ رسول ﷺ

سوال جناب عالی! آپ نے اپنی کتاب ''بنات النبی اُم

ربائبہ“ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسولِ مقبولؐ کی صرف ایک ہی صاحب زادی تھی اور وہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا تھیں۔ جنابِ عالی! آپ نے یہ لکھ کر مسلمہ تاریخ کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ سُنّی و شیعہ محققین و مؤرخین کا اس امر پر اجماع ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار صاحب زادیاں تھیں جن کے نام یہ ہیں: زینب، رقیہ، اُم کلثوم اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا۔

مؤرخین نے لکھا ہے: آنحضرتؐ کی تینوں بیٹیوں نے اچھی خاصی عمر پائی تھی اور ان کی شادیاں بھی ہوئی تھیں۔ البتہ اجماعِ مؤرخین کے مقابلہ میں کچھ شاذ افراد نے یہ موقف اختیار کیا کہ آنحضرت کو خدا نے ایک ہی بیٹی سے نوازا تھا۔ جب کہ ایک بیٹی کا عقیدہ جہاں مسلمہ تاریخ کی نفی ہے وہاں قرآن کریم کی اس آیتِ مجیدہ کی بھی نفی ہے۔

ارشادِ قدرت ہے: يَآَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ...... (الاحزاب:۵۹) ”اے نبیؐ! آپ اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہیں......“

اس آیتِ مجیدہ میں اللہ تعالیٰ نے لفظ ”بنات“ استعمال کیا ہے جو کہ ”بنت“ کی جمع ہے۔ اگر آنحضرتؐ کے ہاں ایک بیٹی ہوئی تو اللہ تعالیٰ لفظ ”بنات“ کی بجائے لفظ ”بنت“ کہتا۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں کسی بھی جگہ ایک بیٹی کا تذکرہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس لفظ ”بنات“ قرآن حکیم میں

دکھائی دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کو خلاف قرآن موقف اختیار کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟

جواب اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب "مخلیفات کتاب ما ٔساۃ الزہراؑ" کی چھٹی جلد میں صفحہ ۴۴ سے صفحہ ۵۵ تک تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کے لیے ہم مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

① جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ قرآن کریم میں لفظ "بنات" آیا ہے۔ جب لفظ بنات جمع ہے تو پھر آنحضرتؐ کی بیٹی ایک کیسے ہو سکتی ہے؟

اس سلسلہ میں گزارش یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں صیغہ جمع استعمال ہو اس سے زیادہ افراد مراد ہوں بلکہ بعض اوقات جمع کے صیغہ سے فرد واحد بھی مراد ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں خداوند عالم کے لیے بیسیوں آیات موجود ہیں جن میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

آیات میں اگرچہ صیغہ جمع استعمال ہوا ہے۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ واحد لاشریک ہی رہے گا۔

② اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ...... (المومنون: ۵۱) اے رسولو! پاکیزہ رزق کھاؤ اور نیک عمل بجالاؤ۔

اس آیت مجیدہ میں خطاب حضرت رسولؐ اکرم سے ہے اور صیغہ "رسل" صیغہ "کلوا" اور صیغہ "واعملوا" جمع ہیں۔ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں کوئی دوسرا رسول موجود نہیں تھا جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ آیت آنحضرتؐ کے ساتھ فلاں فلاں رسول کو مشتمل ہے اور آنحضرتؐ خاتم الانبیاء ہیں۔ آپ کے بعد کسی نئے نبی نے بھی نہیں آنا کہ یہ کیا جائے کہ یہ آیت بعد میں آنے والی رسول پر مشتمل ہے۔ مگر صیغے جمع ہیں اس سے مراد اکیلے حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

معلوم ہوا صیغہ جمع کے لیے ضروری نہیں ہے کہ تعداد زیادہ ہو۔ بعض اوقات فردِ واحد کے لیے بھی جمع کا صیغہ لایا جاتا ہے۔

۳ نعیم بن اشجع نامی شخص نے مسلمانوں کو کافروں کی کثرتِ تعداد سے ڈرانا چاہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی طرف ان الفاظ سے اشارہ کیا:

اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَـكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ (آل عمران:۱۷۳)

''وہ لوگ (مجاہدین اسلام) جن سے لوگوں نے کہا کہ لوگ (کفار) تمہارے خلاف جمع ہو چکے ہیں، تم ان سے ڈرو''۔

یہ بات کہنے والا فردِ واحد تھا مگر اس کے لیے لفظ ''الناس'' استعمال ہوا ہے جو کہ اسم جمع ہے۔ معلوم ہوا کہ جمع کے لیے افراد کا زیادہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ فردِ واحد کے لیے بھی جمع کا صیغہ لایا جاسکتا ہے۔

۴ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک بیوی کو طلاق جاری کی تو اس پر سورۂ طلاق کی یہ آیت نازل ہوئی:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ (الطلاق:۱)

''اے نبیؐ! جب تم بیویوں کو طلاق دینے لگو''۔

لفظ نساء صیغہ جمع ہے لیکن طلاق سب بیویوں کو نہیں ہوئی صرف ایک بیوی کو ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ ضروری نہیں ہے کہ صیغہ جمع سے زیادہ افراد ہی مراد ہوں۔ بعض اوقات فردِ واحد کے لیے بھی صیغہ جمع استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۵ مفسرین اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایک سائل کو حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُولُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ○ (مائدہ:۵۵)

''تمہارا ولی بس اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور وہ جو ایمان لائے جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوۃ ادا کرتے ہیں''۔

اس آیتِ مجیدہ کے الفاظ پر غور فرمائیں۔ اس میں اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ جمع کے صیغے ہیں اور پھر (يُؤْتُوْنَ) جمع ہے اور پھر وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ کے دونوں لفظ جمع ہیں۔

الغرض اس آیت میں چھ صیغے جمع کے لائے گئے ہیں مگر اس سے صرف حضرت علی علیہ السلام ہی مراد ہیں۔

⑨ آیت مباہلہ تلاوت فرمائیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ○ (آل عمران:۶۱)

''جو بھی علم آجانے کے بعد آپؐ سے جھگڑا کرے تو آپ کہہ دیں کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ اور ہم اپنی بیٹیوں کو بلائیں اور تم اپنی بیٹیوں کو بلا لو اور ہم جانوں کو بلائیں اور تم اپنی جانوں کو بلاؤ۔ پھر مل کر مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں''۔

واضح رہے کہ لفظ ''ابناء'' کے مقابلہ میں لفظ ''نساء'' آجائے تو اس کا معنی

بیٹیاں ہوتا ہے جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ کُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَ کُمْ (البقرہ:۴۹)

''وہ تمہارے بیٹے ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو بچاتے تھے''۔

آیت مباہلہ کے تحت جب رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افرادِ مباہلہ کو لے کر گئے تو لفظ ''ابناء'' کے تحت حضرت امام حسن و حضرت امام حسین علیہم السلام کو ساتھ لیا اور لفظ ''نساء'' کے تحت حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کو ساتھ لیا اور لفظ ''انفس'' کے تحت حضرت علیؑ کو ساتھ لیا۔

لفظ ''نساء'' جمع ہے اور اس کی واحد ''امرأۃ'' ہے۔ میدانِ مباہلہ میں جانے والی خاتون ایک تھی لیکن اللہ نے ان کے لیے صیغہ جمع استعمال کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صیغہ جمع کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی تعداد دو سے زیادہ ہو۔ بعض اوقات فردِ واحد پر بھی جمع کے صیغہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر سورۂ احزاب کی آیت مبارکہ میں لفظ ''بناتک'' استعمال ہوا ہے تو اس سے زیادہ افراد مراد لینا ضروری نہیں ہے۔ اس سے فردِ واحد حضرت سیدۂ مراد ہیں۔

علاوہ ازیں لفظ ''بنات'' عام لفظ ہے۔ اس کا اطلاق جہاں بیٹی پر ہوتا ہے وہاں اس کا اطلاق پوتی اور نواسی پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ حُرمتِ نکاح کی آیتِ مجیدہ میں یہ الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔

حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّھٰتُکُمْ وَ بَنٰتُکُمْ ...... (النساء:۲۳)

''تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں''۔

تمام فقہاء کا اجماع ہے کہ اس آیت مجیدہ میں لفظ ''بنات'' سے صرف صلبی بیٹیاں ہی مراد نہیں ہیں بلکہ پوتی اور نواسی بھی اس میں شامل ہیں۔ رسولِ خدا کسی کے

دادا نہیں تھے اور آپ کے ہاں کوئی پوتی موجود نہ تھی لیکن آپؐ نانا تھے۔ خدا نے آپؐ کو حضرت زینبؑ و اُم کلثومؑ جیسی نواسیاں عطا کی تھیں وہ آپؐ کی بنات تھیں۔

اس صورت میں آیت پردہ کی توجیہہ یہ بھی ممکن ہے کہ اے نبیؐ! آپ اپنی بیویوں اور بیٹی اور نواسیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہیں کہ وہ جب گھر سے باہر آئیں تو باپردہ ہو کر آئیں۔

جب لفظ "بنات" میں نواسیوں کا احتمال باقی ہے تو اس لفظ سے آنحضرتؐ کی صلبی بیٹیاں مراد لینے پر آخر اصرار کیوں ہے۔ اصول تو یہ ہے کہ اذاجاء الاحتمال بطل الاستدلال "جب احتمال آجائے تو استدلال باطل ہو جاتا ہے"۔

اکلوتی بیٹی کا استدلال

① مفسرین بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالٰی نے اپنے حبیب کریمؐ کو بیٹے عطا کیے تھے لیکن وہ بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس پر عاص بن وائل نے گستاخی کرتے ہوئے کہا تھا کہ محمدؐ "ابتر" ہیں۔ ان کی نسل ختم ہو چکی ہے۔ اس بدبخت کی اس گستاخی کے جواب میں اللہ نے سورۂ کوثر نازل فرمائی اور فرمایا:

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ "ہم نے آپ کو کوثر عطا کی ہے"۔ یعنی خیر کثیر اور اولادِ کثیر عطا کی ہے۔

اس سورت کے نزول کے بعد حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ولادت ہوئی اور آپ سورۂ کوثر کی عملی تفسیر بن کر دنیا میں آئیں۔

آخر کیا وجہ ہے کہ اگر زینب، رقیہ اور کلثوم بھی آنحضرتؐ کی صلبی بیٹیاں تھیں اور حضرت سیدہ بھی صلبی بیٹی تھی تو خدا نے ان تین بیٹیوں کو "کوثر" کیوں نہ کہا صرف حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کو کوثر کیوں کہا؟!

② قرآن کریم میں حرام رشتے بیان ہوئے ہیں۔ ان کے ضمن میں اللہ نے

یہ فرمایا:

وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ...... (النساء:۲۳)

''تمھاری مدخولہ بیویوں کی لے پالک لڑکیاں جنھوں نے تمہاری آغوش میں پرورش پائی ہے وہ بھی تم پر حرام ہیں''۔

مشہور سُنّی مفسر نے اپنی تفسیر نیشاپوری میں یہ جملے لکھے ہیں: کربائب رسول اللہ من خدیجة ''جیسا کہ خدیجہؑ کی بیٹیاں جنھوں نے رسولؐ اللہ کے گھر میں پرورش پائی تھی''۔

اللہ نے تو ان لڑکیوں کو ''ربیبہ'' قرار دیا ہے اور ربیبہ ہمیشہ ''لے پالک'' کو کہا جاتا ہے سگی بیٹی کو نہیں۔

۳ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد فرمایا:

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ (الضحیٰ:۹)

''یتیم کو مت جھڑکو''۔

علامہ فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں یہ جملے لکھے ہیں: صاح النبی علی بنات خدیجة ''ایک بار رسولؐ خدا نے خدیجہؑ کی بیٹیوں کو جھڑکا تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ''آپ یتیم کو مت جھڑکیں''۔

اربابِ انصاف توجہ فرمائیں: یتیم اس نابالغ کو کہا جاتا ہے جس کا باپ مر گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان لڑکیوں کو رسولؐ خدا کی زندگی میں یتیم کیا ہے۔ اگر رسولؐ خدا ان کے اصلی والد ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں یتیم ہی کیوں کہتا؟

۴ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى

"آپ کہہ دیجیے کہ میں تم سے اس کی کوئی اُجرت نہیں چاہتا مگر اپنے قرابت داروں کی مودت چاہتا ہوں"۔ (الشوریٰ:۲۳)

اللہ تعالیٰ نے فی القربیٰ کو اجر رسالت قرار دیا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا:

یارسول اللہ من هؤلاء قرابتك الذين وجبت علينا مودتهم؟

"آپؐ کے وہ قرابت دار کون ہیں جن کی مودت ہم پر واجب کی گئی ہے؟"

آپؐ نے فرمایا: وہ علیؑ، فاطمہؑ اور ان کی اولاد ہے۔ (هکذا فی کتب التفاسیر)

سوال یہ ہے کہ جب قرابت پیغمبرؐ کی وجہ سے اللہ نے مودت کو فرض کیا اور مذکورہ تینوں خواتین بھی رسولؐ اکرم کی صلبی بیٹیاں تھیں تو ایک بیٹی کو قرابت دار سمجھ کر اس کی مودت کو واجب کیا گیا۔ دوسری بیٹیوں کو اس سے محروم کیوں رکھا گیا جب کہ قرابت تو ان کی بھی وہی تھی جو حضرت سیدہؑ کو حاصل تھی؟!

معلوم ہوتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی بیٹیاں ہی نہیں تھیں ورنہ رسولؐ خدا وجوبِ مودت کے لیے ان کا نام بھی ضرور لیتے۔

۵ آیتِ تطہیر میں صرف ایک بیٹی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی دکھائی نہیں دیتی۔

۶ آیتِ تطہیر کے نزول کے بعد رسولؐ خدا پورے نو ماہ یا چھ ماہ تک روزانہ حضرت زہراؑ کے دروازے پر نماز کے وقت جاتے اور آیت تطہیر پڑھ کر فرماتے تھے: اہلِ بیتؑ! نماز کا وقت ہے۔ (الصواعق المحرقہ)

اگر حضرت عثمان بھی دامادِ رسولؐ ہوتے تو رسولؐ خدا ان کے دروازے پر بھی جاتے اور وہاں کھڑے ہو کر آیت تطہیر پڑھتے اور انھیں اہلِ بیتؑ کہہ کر نماز کی یاد دہانی

کراتے۔ چونکہ رسولؐ اکرم ایسا عمل نہیں کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی صلبی بیٹیاں نہیں تھیں۔

⑦ آیتِ خمس میں موجود ذوی القربیٰ کے تحت آنحضرتؐ نے حضرت سیدہ اوران کی اولاد کو شامل کیا تھا۔ اگر ابوالعاص بن ربیع کی زوجہ زینب اور حضرت عثمان کی دو بیویاں آنحضرتؐ کی قرابت دار ہوتیں تو آنحضرتؐ انھیں بھی خمس کے ''سہم ذی القربیٰ'' میں شامل کرتے؟

معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیبیاں آنحضرتؐ کی صلبی صاحب زادیاں نہیں تھیں۔ اگر وہ آپؐ کی صاحب زادیاں ہوتیں تو آپؐ انھیں بھی خمس کا حق دار قرار دیتے۔

⑧ سُنّی وشیعہ محدثین نے اپنی کتب حدیث میں باب ''مناقب اہلِ بیت'' قائم کیا ہے۔ پورے باب میں مذکورہ تین بیٹیوں کی منقبت میں ایک روایت تک موجود نہیں ہے۔ اگر وہ بھی آنحضرتؐ کی صاحب زادیاں ہوتیں تو شیعہ محدثین نہ سہی کم از کم سُنّی محدثین تو ان کی فضیلت میں کوئی نہ کوئی روایت ضرور نقل کرتے اوران کی دلچسپی کی ایک ممکنہ وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ حضرت عثمان کی بیویاں تھیں۔

آیا بنات اربعہ کی روایت قرین عقل بھی ہے؟

اس مسئلہ کا ایک اور رُخ سے جائزہ لینا چاہتے ہیں لیکن مذکورہ جائزہ سے قبل مؤرخین کی بیان کردہ تاریخ کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں۔

مؤرخین نے لکھا کہ رسولؐ خدا کی عمر پچیس برس کی تھی جب انھوں نے حضرت خدیجہؑ سے شادی کی تھی۔

یہ ابن اسحاق کی بیان کردہ روایت ہے جب کہ الاوائل، جلد اوّل/۱۶۱ میں مرقوم ہے کہ آنحضرتؐ کا نکاح اعلانِ نبوت سے پانچ برس پہلے ہوا تھا۔ جب کہ سیرت مغلطای، ص ۱۲ میں ابن جریح کے حوالے سے مرقوم ہے کہ رسولؐ خدا کی شادی

اعلانِ نبوت سے تین برس قبل ہوئی تھی۔

اس قول کی تائید مجمع الزوائد، جلد ۹/۲۱۹ اور الاوائل، جلد اوّل/۱۶۱ میں بھی موجود ہے۔

اب اگر پانچ سال یا تین سال اعلانِ نبوت سے قبل شادی کی تاریخ کو صحیح مان لیا جائے تو اربابِ دانش یہ فیصلہ کریں کہ اس عرصہ میں تین صاحب زادیاں پیدا ہوئیں اور پھر زینب کی شادی ابوالعاص بن ربیع سے ہوئی اور رقیہ وکلثوم کی شادی ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ عتیبہ سے کیسے ہوگئیں؟

کیا کوئی دانش مند ہمیں یہ نکتہ سمجھائے گا؟

بناتِ رسولؐ کے لیے فیصلہ کن روایت

ابوالحمراء نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے، آپؐ نے فرمایا:

یاعلی اوتیت ثلاثاً لم یؤتهن احد ولا انا اوتیت صهرا مثلی ولم اوت انا مثلی واوتیت صدیقة مثل ابنتی ولم اوت مثلها واوتیت الحسن والحسین من صلبك ولم اوت من صلبی مثلهما ولکنکم منی وانا منکم

"علیؑ! اللہ نے تجھے تین ایسی خوبیاں عطا کی ہیں جو کہ کسی کو بھی نہیں ملیں۔ حد یہ ہے کہ مجھے بھی نہیں ملیں:

① خدا نے تجھے مجھ جیسا سُسر عطا کیا جب کہ مجھے مجھ جیسا سُسر عطا نہیں ہوا۔

② خدا نے تجھے فاطمہ زہرا جیسی صدیقہ بیوی عطا کی جب کہ مجھے اس جیسی بیوی نہیں ملی۔

۳ خدا نے تجھے حسن و حسین علیہم السلام جیسے فرزند عطا کیے جب کہ مجھے ان سے صلبی بیٹے عطا نہیں ہوئے۔ لیکن تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں"۔

اگر حضرت عثمان بھی داماد ہوتے تو وہ بھی کہتے کہ اس شرف میں مَیں بھی شریک ہوں۔ (حوالہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں: احقاق الحق، قسم الملحقات مرعشی نجفی، جلد ۵/۴۷، جلد ۴/۴۴۳، بحوالہ مناقب عبداللہ الشافعی، ص ۵۰ (قلمی نسخہ) مناقب کاش، ص ۲۷ (قلمی نسخہ)، نظم درر السمطین زرندی الحنفی، ص ۱۱۳-۱۱۴، مقتل خوارزمی، جلد اوّل/ ۱۰۹)

یہی روایت حضرت ابوذرؓ سے بھی مرفوعاً منقول ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: ینابیع المودۃ، ص ۲۵۵، احقاق الحق قسم ملحقات، جلد ۷/ ۱۸)

۴ سابقہ سوال کے جواب ہم صاحبِ استغاثہ کا یہ قول نقل کر چکے ہیں کہ زینب و رقیہ حضرت خدیجہؑ کی بہن کی بیٹیاں تھیں۔ ان کی بہن کی وفات ہوئی تو حضرت خدیجہؑ نے انھیں گود میں لیا اور پھر جب حضرت خدیجہؑ کا رسولؐ خدا سے عقد ہوا تو وہ بچیاں بھی ان کے ہمراہ رسولؐ اکرم کے گھر میں آگئیں اور انھوں نے حضرت خدیجہؑ اور آنحضرتؐ کی گود میں پرورش پائی۔ دستورِ عرب کے مطابق وہ آنحضرت کی بیٹیاں مشہور ہو گئیں۔ (ملاحظہ فرمائیں: الاستغاثہ، جلد اوّل/ ۶۸-۶۹)

۵ ابن شہر آشوب لکھتے ہیں: زینب و رقیہ حضرت خدیجہ کی بہن "ہالہ" کی بیٹیاں تھیں اور کتاب الانوار اور کتاب البدع میں بھی یہی مرقوم ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: مناقب آل ابی طالبؑ، جلد اوّل/ ۱۵۹، بحار، قاموس الرجال اور تنقیح المقال میں بھی ابن شہر آشوب کے حوالے سے یہی روایت مذکور ہے)۔

علاوہ ازیں الانوار، کشف اور لمع اور کتاب بلاذری میں مرقوم ہے: زینب و

رقیہ جحش کی صاحب زادیاں تھیں اور انھوں نے آنحضرتؐ کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ (ملاحظہ فرمائیں: مناقب آل ابی طالب، جلد اوّل/۱۶۲)

۶ حضرت خاتونِ جنت نے اپنے ایک خطبہ میں اپنی اکلوتی بیٹی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا: آپؑ نے یہ خطبہ مسجد نبویؐ میں دیا۔ اس وقت مسجد نبویؐ مہاجرین وانصار سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بی بی نے اپنے خطبہ کے دوران یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

فان تعزوه وتعرفوه تجدوه ابی دون نسائکم واخا ابن عمی دون رجالکم ولنعم المقربی الیه

"اگر تم رسولِؐ خدا کی نسبت کرو گے اور انھیں پہچانو گے تو تم انھیں میرا والد پاؤ گے، وہ تمھاری بیویوں کے والد نہیں، تم انھیں میرے ابن عم (علیؑ) کا بھائی پاؤ گے وہ تمھارے مردوں کے کچھ نہیں لگتے۔ آنحضرتؐ کی طرف نسبت کتنی ہی اچھی ہے"۔

جب حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا نے بھرے دربار میں یہ فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف میرے ہی والدین ہیں تو حضرت عثمان یا ان کے کسی بھی خواہ نے یہ کیوں نہ کہا کہ بی بی وہ تو رقیہ وامِ کلثوم اور زینب کے بھی والد تھے صرف آپؑ کے تو والد نہ تھے۔

بھرے دربار میں سے تمام افراد کا خاموش رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کی آپؑ کے علاوہ کوئی بھی صلبی بیٹی نہ تھی اور آپ آنحضرتؐ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔

یہاں پر کچھ معترض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ویسے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار بیٹیاں تھیں لیکن اللہ نے خاتونِ جنت کو چُن لیا تھا۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ نظریہ غلط ہے کیونکہ سیدہ سلام اللہ علیہا نے مہاجرین وانصار کے بھرے دربار میں یہ کہا تھا: کان ابی دون نسائکم "آنحضرت تمہاری بیویوں کے بجائے صرف میرے ہی والد تھے؟!

جب حضرت خاتونِ جنت یہ فرما رہی تھیں تو حضرت عثمان کا حق تھا کہ وہ کہتے کہ بی بی آنحضرتؐ میری دو بیویوں کے بھی باپ تھے۔ لیکن ان کا خاموش رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ ان کی بیویوں کے باپ نہیں تھے۔

اگر وہ تین بیٹیاں بھی آنحضرتؐ کی صلبی بیٹیاں تھیں تو ان کی موجودگی میں عاص بن وائل نے آنحضرتؐ کو "ابتر" ہونے کا طعنہ کیوں دیا تھا۔ اس پر اللہ نے سورۂ کوثر نازل فرمائی اور حضرت زہراؑ کو مجسم کوثر بنا کر آنحضرتؐ کو تحفہ کیوں عطا فرمایا؟

سچ یہ ہے کہ چار بیٹیوں کا افسانہ بنی اُمیہ کا اختراع کردہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے انھوں نے حضرت عثمان کی شان کو بلند کرنا چاہا تھا اور پھر اس افسانے کا اس تسلسل سے پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مؤرخین نے اسی تاریخی حقیقت سمجھ کر اپنی کتابوں میں لکھ دیا۔ بعض شیعہ مؤرخین بھی بنی اُمیہ کے بچھائے ہوئے دام میں جا پھنسے ورنہ نہ تو قرآن میں چار بیٹیوں کا کہیں ذکر ہے اور نہ ہی عقلی اور نقلی تقاضوں سے چار بیٹیوں کا اثبات ہے۔

اس بحث کے آخر میں ملا علی قاری کی رائے کا مطالعہ فرمائیں۔ انھوں نے شرح فقہ اکبر میں یہ الفاظ کہے:

وسمیت بتولا لا نقطاعھا عن نسآء زمانھا دینا وشرفا وحسبا ونسباً

"حضرت خاتونِ جنت دین، شرف اور حسب ونسب میں اپنے دور کی خواتین سے منقطع اور ممتاز تھیں"۔ (شرح فقہ اکبر، ص ۱۳۰)

حضرت فاطمہ زہراؑ کو بتول کہا جاتا ہے اور بتول کے معنی ہیں وہ بی بی جو

دوسروں سے منقطع ہو اور دوسروں سے ممتاز ہو۔

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت سیدہؑ کی تین بہنیں اور بھی تھیں تو بی بیؑ "نسب" میں نساء اہلِ زمان سے ممتاز کیسے ہو سکتی تھیں؟ جب مُلا علی قاری لکھتے ہیں کہ بی بی "نسب" میں بھی بتول ہے، یعنی جو نسب حضرت سیدہؑ کو حاصل ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔

چھٹا حصہ

در تفسیر آیات عقائد

جمع قرآن اور مصاحف کا نذرِ آتش کیا جانا

سوال عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان جامع القرآن تھے۔ کیا ہمارا مذہب انھیں جامع القرآن تسلیم کرتا ہے؟

جواب ① جمع قرآن کے مسئلہ کا عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیامہ:۱۷)

"اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے"۔

② ہم نے اپنی کتابوں میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآنِ مجید حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں جمع کیا گیا تھا اور ہم نے اس کے قطعی دلائل نقل کیے ہیں جن کی تردید کسی سے بھی ممکن نہیں ہے۔

③ حضرت عثمان کے جامع القرآن کا زیادہ سے زیادہ یہی مطلب ہے کہ انھوں نے لوگوں کو حذیفہ بن الیمان کے مشورہ کے تحت ایک ہی قرأت پر جمع کیا تھا اور انھوں نے لغتِ قریش میں مصاحف لکھوا کر عالمِ اسلام میں اس کے نسخے بھیجے تھے اور اس کے علاوہ باقی مصاحف کو انھوں نے تلف کرنے کے لیے نذرِ آتش کر دیا تھا۔

جہاں تک لوگوں کو ایک قرأت پر جمع کرنے کا مسئلہ ہے تو یقیناً انھوں نے ایک مثبت کارنامہ سرانجام دیا تھا لیکن قرآنی نسخوں کو نذرِ آتش کر کے انھوں نے بہت

بڑی غلطی کی تھی کیونکہ اس سے قرآن کی بے ادبی لازم آتی ہے۔

تحریف قرآن اور محدث نوری

سوال جناب عالی! محدث نوری کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تحریف قرآن کے قائل تھے اور انھوں نے اثبات تحریف کے لیے "فصل الخطاب" نامی ایک کتاب لکھی تھی۔

آقا بزرگ تہرانی نے ان کے متعلق یہ لکھا ہے کہ محدث نوری نے تحریف کے عقیدہ کی تردید کی تھی جب کہ ان کی کتاب سے تو تحریف کا اثبات ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟

جواب جہاں تک کتاب "فصل الخطاب" کا تعلق ہے تو اس میں محدث نوری نے تحریف کا اثبات کیا ہے۔ اور اگر ان کی کتاب میں موجود دلائل کے تکرارات کو حذف کیا جائے تو انھوں نے مجموعی طور پر بارہ دلائل پیش کیے تھے۔ دس دلائل کتب اہل سنت سے پیش کیے اور دو دلیلیں کتب شیعہ سے فراہم کی تھیں۔ لیکن انھوں نے کتب شیعہ سے جو دو دلیلیں پیش کی ہیں ان کے راویوں کا تعلق کذاب اور وضاع غلاۃ سے ہے، مثلاً سیاری، ابن ظبیان اور محمد بن محمد کوفی وغیرہ۔

انھوں نے کچھ روایات ایسی نقل کی ہیں جن کا تعلق تفسیری روایات سے ہے اور ان کا تحریف سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اگر آپ فصل الخطاب کے دلائل کی تردید پڑھنا چاہیں تو پھر ہماری کتاب "حقائق ھامۃ حول القرآن" کا مطالعہ فرمائیں۔

سأل سائل بعذاب واقع اور امامت علی علیہ السلام

سوال برادران اہل سنت کہتے ہیں کہ سورۂ معارج کی پہلی آیت سأل سائل بعذاب واقع (ایک سوال کرنے والے نے واقع

ہونے والے عذاب کا سوال کیا) کا تعلق واقعہ غدیر سے نہیں ہے۔ آپ وضاحت فرمائیں کہ یہ سورہ مدنی ہے یا مکی ہے؟

جواب اگرچہ تفسیر در منثور، جلد ۶/۲۶۳ میں ابن ضریس، نحاس، ابن مردویہ اور بیہقی کے حوالے سے مرقوم ہے کہ یہ سورہ مکی ہے۔ لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ یہ آیت واقعۂ غدیر کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی، جب واقعۂ غدیر کی شہرت ہر طرف پھیلی تو اس وقت حارث بن نعمان فہری آنحضرتؐ کے پاس آیا۔

علامہ امینی کی تحقیق یہ ہے کہ اس دشمنِ علیؑ کا نام جابر بن نضر بن الحارث بن کلدہ العبدری تھا۔ اس شخص کا باپ نضر جنگِ بدر میں قید ہوا تھا۔ رسولؐ خدا کے حکم سے حضرت علیؑ نے اسے قتل کیا تھا۔

باپ کے قتل کے کچھ عرصہ بعد اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ اعلانِ غدیر کے بعد وہ آنحضرتؐ کے پاس آیا اور اس نے کہا:

محمدؐ! آپؐ نے ہمیں "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھنے کا حکم دیا تو ہم نے پڑھا۔ آپؐ نے ہمیں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہم نے اس پر عمل کیا لیکن آپؐ نے اس پر اکتفا نہیں کی اور اپنے ابن عم کا بازو پکڑ کر اسے ہم پر فضیلت دی اور آپؐ نے یہ کہا: من کنت مولاہ فعلی مولاہ یہ جو کچھ آپؐ نے غدیر خم میں کہا یہ آپؐ نے اپنی طرف سے کہا یا خدا کے حکم کے تحت کہا؟

رسولِؐ خدا نے جواب دیا: اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، میں نے حکمِ الٰہی کے تحت یہ سب کچھ کہا ہے۔

جابر نے پشت پھیری وہ اپنی سواری کی طرف جانے لگا اور اس وقت اس نے یہ کہا: "خدایا! محمدؐ جو کچھ کہہ رہا ہے اگر وہ حق ہے تو مجھ پر آسمان سے پتھروں کی بارش فرما، یا ہم پر دردناک عذاب نازل فرما"۔

ابھی یہ شخص اپنی سواری تک نہ پہنچا تھا کہ اس کے سر پر ایک پتھر لگا جو اُس کے وجود کو چیرتا ہوا اس کی مقعد سے نکلا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے سال سائل بعذاب واقع کی آیت نازل فرمائی۔[1]

ابنِ تیمیہ کے اعتراضات

ابن تیمیہ نے اس روایت پر حسب ذیل اعتراضات کیے ہیں:

(1) اس روایت میں ایک طرح کا تضاد پایا جاتا ہے کیونکہ غدیر خم کا واقعہ بالاجماع حجۃ الوداع کے بعد پیش آیا تھا جب کہ روایات میں ہے کہ حارث بن نعمان فہری آنحضرتؐ کے پاس ''ابطح مکہ'' میں آیا۔

حالانکہ اس وقت تو آنحضرت کو مدینہ پہنچ جانا چاہیے تھا۔ یہ درمیان میں ''ابطح مکہ'' کہاں سے آ گیا۔

---

[1] (ملاحظہ فرمائیں: الغدیر، جلد اوّل/۲۳۹، بحوالہ کتب مندرجہ ذیل غریب القرآن، لابی عبداللہ، شفاء الصدور، لابی بکر نقاش، الکشف والبیان ثعلبی۔ حاکم حسکانی کی کتاب دعاۃ الهداۃ۔ قرطبی کی جامع لاحکام القرآن، تفسیر سورۂ معارج، تذکرۃ الخواص، ص ۱۹، وصابی الشافعی کی کتاب الاکتفاء، فرائد السمطین، باب ۱۳، معراج الوصول زرندی حنفی۔ سمہودی الشافعی کی کتاب جواہر العقدین۔ تفسیر ابی السعود العمادی، جلد ۲۹۲/۸، تفسیر سراج المنیر، جلد ۳/ ۳۶۴۔ جمال الدین شیرازی کی کتاب الاربعین فی مناقب امیر المومنین۔ مناوی کی کتاب فیض القدیر فی شرح الجامع الصغیر، جلد ۶/ ۲۱۸۔ ابن عیدروس کی کتاب العقد النبوی والسر المصطفوی۔ نزہۃ المجالس، جلد ۲/ ۲۴۲ للصفوری الشافعی۔ قادری المدنی کی کتاب سیرت حلبیہ، جلد ۳/ ۳۰۲۔ حنفی شافعی کی شرح جامع الصغیر، جلد ۲/ ۳۸۷۔ محمد صدر العالم کی کتاب معارج العلیٰ فی مناقب المرتضیٰ۔ محمد محبوب عالم کی تفسیر شاہی۔ زرقانی کی شرح مواہب لدنیہ، جلد ۷/ ۱۳۔ عبدالقادر حنفی الشافعی کی ذخیرۃ المآل فی شرح عقد جواہر اللآلی۔ محمد بن اسماعیل یمانی کی الروضۃ الندیہ۔ نور الابصار شبلنجی، ص ۷۸۔ رشید رضا کی تفسیر المنار، جلد ۶/ ۴۶۴)

② اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ سورہ معارج مکّی ہے۔

③ اللهم ان کان هذا الحق من عندك فامطر علینا حجارة من السماء کی آیتِ مجیدہ کافر کی جس بددعا کو بیان کیا ہے اس کا تعلق بالاتفاق جنگِ بدر کے بعد سے ہے جب کہ غدیر کا واقعہ بدر سے آٹھ سال بعد واقع ہوا۔

④ مشرکینِ مکّہ نے اپنے لیے مکّہ میں ان الفاظ سے بددعا کی تھی اور ان کے مطالبہ کے باوجود ان پر عذاب نازل نہ ہوا کیونکہ اس وقت رسولؐ خدا مکہ میں موجود تھے۔ اللہ نے فرمایا تھا:

مَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِیْهِمْ (انفال:۳۳)

"جب تک آپ ان میں موجود ہیں خدا انھیں عذاب نہیں دے گا"۔

⑤ اگر منکرِ ولایت علیؑ پر عذاب آیا ہوتا تو پھر یہ واقعہ بھی اصحابِ فیل کے واقعہ کی مانند مشہور ہوتا جب کہ اربابِ مسانید وصحاح نے اس کا کوئی تذکرہ تک نہیں کیا۔

⑥ بیان کردہ روایت کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حارث مسلمان تھا اور عہدِ نبویؐ میں کسی بھی مسلمان پر عذاب نازل نہیں ہوا تھا۔

⑦ حارث بن نعمان بزمِ صحابہ میں بالکل غیر معروف ہے۔ اس کا تذکرہ نہ تو الاستیعاب میں ہے اور نہ ہی ابن مندہ اور نہ ہی ابونعیم نے حالاتِ صحابہ میں اس کا کہیں نام لیا ہے۔

علامہ امینی کے جوابات

علامہ امینی نے ابن تیمیہ کے مذکورہ سوالات کے جواب میں فرمایا:

① لفظ "ابطح" صرف چند کتابوں میں مذکور ہے جب کہ دوسری بہت سی کتابوں میں وضاحت کے ساتھ لکھا ہوا ہے کہ ولایتِ علیؑ کا منکر مسجد نبویؐ میں آیا

تھا۔ چنانچہ سبط ابن جوزی نے تذکرۃ الخواص میں اور معارج العلیٰ اور سیرت حلبیہ میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ وہ شخص مسجد نبویؐ میں آیا تھا۔

۲ ابن تیمیہ کی شوخ چشمی ہے کہ اس نے لفظ "ابطح" کو مکہ کے ساتھ مختص قرار دیا ہے۔ اس لفظ کا اطلاق ہر اس جگہ پر ہوتا ہے جو بارش کے پانی کی گزرگاہ ہو اور اس میں چھوٹے چھوٹے کنکر ہوں۔ مزید تسلی کے لیے معجم البلدان، جلد ۲/ ۲۱۳، ۲۱۵ کی طرف رجوع فرمائیں۔

صحیح بخاری میں ایسی احادیث موجود ہیں جن میں لفظ بطحاء ذی الحلیفہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جب کہ ذی الحلیفہ مدینہ سے متصل وادی ہے جہاں سے حجاج عمرہ وحج کا احرام باندھتے ہیں۔ (ملاحظہ فرمائیں: صحیح بخاری، جلد اوّل/ ۱۸۱ و ۱۷۵۔ صحیح مسلم، جلد اوّل/ ۳۸۲۔ بی بی عائشہ نے قبر پیغمبر کے متعلق لفظ "بطحاء" کا استعمال کیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں: مصابیح السنہ بغوی، جلد اوّل/ ۸۳)

ابن تیمیہ کا یہ اعتراض ہی غلط ہے کہ لفظ "ابطح" یا بطحاء سے مکہ کی نزدیکی وادی واقع ہے، جب کہ حذیفہ بن اسید اور عامر بن ابی لیلیٰ کی روایت میں یہ الفاظ دکھائی دیتے ہیں کہ جب رسولؐ خدا حجۃ الوداع سے واپس آرہے تھے تو جحفہ کے قریب کچھ کیکر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے جو کہ "بطحاء" (پانی کی گزرگاہ) میں واقع تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ان کے نیچے کوئی نہ جائے۔

مزید تفصیل کے لیے الغدیر، جلد اوّل/ ۲۶ و ۳۶۔ معجم البلدان، ص ۲۱۳-۲۲۲ اور بلدان یعقوبی، ص ۸۴ کا مطالعہ فرمائیں۔ لفظ بطحاء، بنیادی طور پر مکہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ روایات میں ہمیں بطحاء واسط، بطحاء ذی الحلیفہ، بطحاء ابن ازہر اور بطحاء مدینہ کا تذکرہ دکھائی دیتا ہے اور یہ مکی بطحاء سے بڑا ہے۔

بطحاوی علوی نے اپنے دادا کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے:

وبطحا المدينة لی منزل فياحبذا ذاك من منزل

"میرا گھر بطحائے مدینہ میں واقع ہے اور وہ بہت ہی اچھا گھر ہے"۔

حیص بیص المتوفی ۵۷۴ھ نے لکھا ہے:

ملكنا فكان العفو منا سجية فلما ملكتم سال بالدم ابطح

"جب ہماری حکومت قائم ہوئی تو ہم نے درگزر کی عادت کو اپنایا

اور جب تم حاکم بنے تو پانی کی گزرگاہوں میں خون بہنے لگ گیا"۔

مشہور ایام عرب میں ایک دن کو "یوم البطحا" کہا جاتا ہے جب کہ یہ لڑائی "بطحائے ذی وقار" میں واقع ہوئی تھی جو کہ کوفہ کے قریب ہے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منسوب ایک شعر میں یہ الفاظ کہے گئے ہیں:

انا ابن المبجل بالابطحين وبالبيت من سلفی غالب

میبذی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ابطحین سے مکہ و مدینہ مراد ہے۔

۲ ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ شیعہ کہتے ہیں: سأل سائل...... کی آیت واقعہ غدیر کے بعد میں نازل ہوئی جب کہ مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ سورت مکی ہے۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ مفسرین کا اجماع اس امر پر ہے کہ مجموعی طور پر یہ سورت مکی ہے۔ اس کا یہ مطلب و معنٰی ہرگز نہیں ہے کہ اس سورت کی تمام آیات مکی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ سورۂ معارج کی یہ ابتدائی آیات مدنی ہوں۔

اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جس سورہ کو مکی کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی آیات لازمی طور پر مکی ہوتی ہیں بالخصوص ایسی آیات جن سے سورتوں کے نام کا استفادہ ہوتا ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ قرآن کریم میں کئی ایسی سورتیں موجود ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ مکی ہیں لیکن ان کی ابتدائی آیات مدنی ہیں۔

اسی طرح سے کئی سورتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ مدنی ہیں لیکن ان کی ابتدائی آیات مکی ہوتی ہیں۔ مثلاً سورۂ عنکبوت مکی ہے لیکن اس کی پہلی دس آیات مدنی ہیں۔ (جامع البیان، جلد ۲۰/۸۶، الجامع لاحکام القرآن، جلد ۱۳/۳۲۳، شربینی کی السراج المنیر، جلد ۳/۱۱۶)

سورۂ کہف مکی ہے لیکن اس کی پہلی سات آیات مدنی ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن، جلد ۱۰/۳۴۶، الاتقان، جلد اوّل/۱۶)

سورۂ مطففین مکی ہے لیکن اس کی پہلی آیت جس سے اس کے نام کا استفادہ کیا گیا ہے، مدنی ہے۔ (جامع البیان، جلد ۳۰/۵۸)

اسی طرح سے سورہ اللیل مکی ہے لیکن اس کی پہلی آیات مدنی ہیں۔ (الاتقان، جلد اوّل/۱۷)

الغرض قرآن کریم میں بہت سی ایسی مدنی سورتیں موجود ہیں جن کی کچھ آیات مکی ہیں اور کچھ ایسی مکی سورتیں موجود ہیں جن میں کچھ مدنی آیات شامل ہیں۔

قرآن کریم میں کچھ مدنی سورتیں ایسی ہیں جن میں مکی آیات شامل ہیں مثلاً سورہ مجادلہ مدنی ہے لیکن اس کی پہلی آیات مکی ہیں اور ان سے ہی سورت کے نام کا استفادہ کیا گیا ہے۔

سورۃ البلد مدنی ہے لیکن پہلی آیت مکی ہے اور چوتھی آیت بھی مکی ہے۔

۲۔ اگر بالفرض ہم یہ مان لیں کہ سورۂ معارج کی جملہ آیات مکی ہیں پھر بھی ہماری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم یہ کہیں گے کہ یہ سورہ توبہ نازل ہوئی ہے۔

قرآن حکیم میں بہت سی ایسی آیات موجود ہیں جن کے متعلق علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ آیات اتنی موثر ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بار بار دہرایا ہے مثلاً بسملہ شریف، سورۂ روم کی ابتدائی آیات اور آیت روح اور مَا کَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْۤا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِکِیْنَ ......کی آیت اور اسی طرح سے اقم الصلاۃ طرفی النہار کی آیت اور اسی طرح سے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کی آیت مجیدہ الغرض مذکورہ بالا آیات کو کئی بار نازل کیا گیا ہے۔

حد یہ ہے کہ جب مکہ میں نماز فرض ہوئی تو سورۂ فاتحہ نازل ہوئی اور جب مدینہ میں قبلہ تبدیل ہوا تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ دوبارہ نازل کی۔ دو مرتبہ نزول کی وجہ سے اسے مثانی کہا جاتا ہے۔

◈ ابن تیمیہ نے کہا کہ شیعہ حارث بن نعمان فہری کی جس بددعا کو نقل کرتے ہیں یہ بددعا دراصل قرآن کی ایک آیت میں بیان کی گئی ہے اور واقعۂ غدیر سے کئی برس قبل ایک دشمن دین نے یہ بددعا کی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح سے اہلِ ایمان اپنے بزرگ اہلِ ایمان کی دعاؤں کو یاد کر کے خدا کے حضور انھیں پیش کرتے ہیں اسی طرح سے حارث بن نعمان فہری نے بھی اپنے جیسے بدترین کافر کی بددعا کے الفاظ دہرائے تھے۔

◈ ابن تیمیہ نے لکھا کہ کفار نے اگرچہ اپنے لیے عذاب طلب کیا تھا لیکن خدا نے یہ کہہ کر ان پر عذاب نہیں بھیجا تھا کہ ان میں رسولؐ موجود ہیں اور رسولؐ کے ہوتے ہوئے عذاب نازل ہو تو کیسے نازل ہو؟

جب رسولؐ کی موجودگی میں کافروں پر عذاب نہیں آیا تو ولایت علیؑ کے منکر پر کیسے عذاب آ گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات کچھ اسباب کی وجہ سے مشرکین پر عذاب نازل نہیں کیا جاتا مثلاً خدا کو معلوم تھا کہ ان میں سے اکثر عنقریب اسلام قبول کر لیں گے یا پھر اس کا بعض اوقات سبب یہ ہوتا تھا کہ ابھی ان کی صلب میں اہلِ ایمان باقی ہوتے تھے۔ لیکن خدا نے مدینہ میں جس منکرِ ولایت علیؑ پر عذاب بھیجا تو خدا کو معلوم تھا

کہ یہ آئندہ بھی ولایت علیؑ کو تسلیم نہیں کرے گا اور خدا یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی نسل میں سے کسی محبّ علیؑ نے پیدا نہیں ہونا۔

ابن تیمیہ کو ویسے بھی غلط فہمی ہوئی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ ما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم کا مطلقاً مقصود یہ ہے کہ نبی اکرم کی موجودگی میں عذاب نہیں آسکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ نبیؐ کی موجودگی کی وجہ سے فنا کرنے والا عذاب نہیں آسکتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کچھ مشرکین پر بھی عذاب نہیں آسکتا۔

کیونکہ روایات بیان کرتی ہیں کہ نبی اکرمؐ نے قریش کے لیے قحط سالی کی بددعا کی تھی جس کی وجہ سے بارش رُک گئی اور زمین کی پیداوار ختم ہوگئی اور ان پر ایسا قحط طاری ہوا کہ انھوں نے مُردار اور کتوں کو کھایا تھا۔ اگر رسولؐ خدا کی زندگی عذاب سے مکمل طور پر مانع ہوتی تو ان پر قحط کا عذاب کیوں نازل ہوتا۔ (صحیح مسلم، جلد ۲/ ۳۶۸، صحیح بخاری، جلد ۲/ ۱۲۵، تفسیر رازی، جلد ۷/ ۳۶۷)

مستہزئین (رسول اکرمؐ کا مذاق اڑانے والوں) پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا جن میں ابی زمعہ اسود بن مطلب، مالک بن طلالہ شامل تھے۔ (الکامل فی اللغۃ، جلد ۳/ ۱۲۳)

اور ایسا ہی عذاب حکم بن ابی العاص اور جمرہ بنت حارث پر نازل ہوا تھا۔ (الاستیعاب برحاشیہ الاصابہ، جلد اوّل/ ۲۱۸، النہایہ فی اللغۃ، جلد اوّل/ ۳۴۵، الاصابہ، جلد اوّل/ ۳۴۵-۳۴۶، خصائص کبریٰ، جلد ۲/ ۷۹۔ الاصابہ، جلد اوّل/ ۲۷۶، الخصائل الکبریٰ، جلد ۲/ ۷۹)

اور رسولؐ خدا پر جھوٹ باندھنے والے شخص پر بھی حضرتؐ کی زندگی میں عذاب نازل ہوا تھا۔ (خصائص کبریٰ، جلد ۲/ ۷۸)

اسی طرح سے لہب بن ابی لہب اور عتبہ بن ابی لہب پر عذاب خداوندی نازل

ہوا تھا۔ (الخصائص، جلد اوّل/۱۴۷، الخصائص جلد اوّل/۱۴۷، النہایہ فی اللغۃ، جلد ۳/۲۱)

اللہ تعالیٰ نے قریش کو دھمکی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (حم السجدہ:۱۳)

"اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں اسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا کہ عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا"۔

اگر قریش مجموعی طور پر انکار رسالت کرتے تو یقیناً ان پر بھی عاد و ثمود جیسا عذاب نازل ہوتا۔ ان میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے تھے جس کی وجہ سے وہ برباد کر دینے والے عذاب سے بچ گئے تھے۔

اگر وجود نبی عذاب سے مانع ہوتا تو قریش کو یہ دھمکی نہ دی جاتی اور حکم بن ابی العاص اور دوسرے دشمنانِ دین پر عذاب نازل نہ ہوتا۔

۵ ابن تیمیہ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اگر حارث بن نعمان فہری پر عذاب نازل ہونے کا واقعہ صحیح ہوتا تو اصحابِ فیل کے واقعہ کی طرح سے یہ واقعہ بھی مشہور ہوتا لیکن مورخین و محدثین کی اکثریت نے اس واقعہ کو نقل نہیں کیا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

ابن تیمیہ کے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اصحابِ فیل نے مرکز اسلام کعبہ کو تباہ کرنے کی منظم کوشش کی تھی اور ایک ملک کا سربراہ لشکر لے کر مکہ کی طرف چلا تھا۔ اس کی وجہ سے اس واقعہ کو وسیع شہرت حاصل ہوئی۔ جب کہ حارث بن نعمان فہری ابرہہ اشرم کی طرح سے کسی ملک کا سربراہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی لاؤ لشکر اور ہاتھی تھے لہٰذا فطری طور پر اس کے واقعہ کو وہ اہمیت حاصل نہ ہو سکتی تھی جو

کہ ابرہہ کے واقعہ کو حاصل ہوئی۔ اس کی حیثیت دیگر معجزاتِ نبوی کی طرح سے ہے۔ نبی اکرمؐ کے اکثر معجزات بطریق احاد منقول ہیں۔ حارث کے واقعہ کو چھپانے کے لیے حکومتی کارندوں نے بھرپور کوششیں کی تھیں اور اموی اور عباسی حکمرانوں نے ہر دور میں یہ کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح سے واقعۂ غدیر لوگوں کے اذہان سے محو ہو جائے اور لوگوں کو اعلانِ ولایت کا علم ہی نہ ہو سکے۔

جہاں تک ابن تیمیہ کے اس اعتراض کا تعلق ہے کہ مصنفین نے اس واقعہ کو کیوں نہیں لکھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سے مصنفین نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ البتہ اگر چمگادڑ کی طرح سے ابن تیمیہ کو وہ حوالے دکھائی نہ دیں تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔

۶ روایات سے جس طرح سے حارث کا اسلام ثابت ہوتا ہے اسی طرح سے اس کا ارتداد بھی ثابت ہوتا ہے اور عذاب زمانہ اسلام میں نہیں آیا بلکہ اس کے زمانہ ارتداد میں آیا ہے۔

ابن تیمیہ کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ عہدِ رسولؐ میں کسی بھی مسلمان پر عذاب نازل نہیں ہوا تو اس کا یہ دعویٰ بھی باطل ہے۔ اسے شاید جمرہ بنت حارث کا واقعہ معلوم نہیں ہے۔

ابن تیمیہ کو شاید اس واقعہ کا علم نہیں ہے جسے مسلم نے صحیح میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے ازراہِ شماتت نبیؐ کے سامنے زمین پر ٹھوکر ماری تھی۔ اسی طرح سے ایک شخص نماز کی حالت میں اپنے سر کے بالوں کو سنوار رہا تھا تو رسولؐ خدا نے اسے بددعا دیتے ہوئے کہا تھا: قبح اللہ شعرک "خدا تیرے بالوں کو خراب کرے"۔ وہ شخص فوراً گنجا ہو گیا۔

۷ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ اگر اس واقعہ کا کوئی وجود ہوتا تو حالاتِ صحابہ پر

لکھی گئی کتابوں میں تو اس شخص کا کہیں نام ونشان دکھائی دیتا لیکن جماعت صحابہ میں اس شخص کا کہیں نام دکھائی نہیں دیتا۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ ابن تیمیہ مفروضوں کے سہارے سفر کرنے کا عادی ہے۔ اسے یہ کس نے بتایا ہے کہ حیات صحابہ پر لکھی جانے والی کتابوں میں تمام صحابہ کا ذکر موجود ہے۔

چنانچہ عسقلانی نے "الاصابہ" میں اس کی وضاحت کی ہے کہ آنحضرتؐ کا دیدار کرنے والے اور آپ کی گفتگو سننے والوں کی تعداد ایک لاکھ افراد سے زیادہ تھی اور اتنے افراد کا تذکرہ مورخین کے لیے ناممکن ہے۔

علاوہ ازیں اس کا ذکر نہ کرنے کی ممکنہ وجہ اس کا ارتداد ہے۔

اسی عنوان پر علامہ طباطبائی نے تفسیر المیزان کی جلد ۲/۵،۶-۱۱ اور جلد ۹/۶۷-۱۷ پر بھی مفصل بحث کی ہے۔

عصمت رسولؐ اور سورہ عبس

سوال سورہ عبس میں ترش روئی اور منہ پھیرنے کا ذکر موجود ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس سورت میں رسولؐ خدا کو تادیب کی گئی ہے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ○ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ○ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ○ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ○ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ○ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ○ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ○ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ○ وَهُوَ يَخْشٰى ○ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ○ (سورہ عبس: ۱-۱۰)

"ترش رو ہوا اور بے رُخی برتی۔ اس بات پر کہ اندھا اس کے پاس گیا۔ تمھیں کیا خبر کہ شاید وہ پاکیزگی حاصل کرے یا نصیحت حاصل کرے، اور نصیحت اس کے لیے فائدہ مند ہو جائے جب کہ جو شخص بے پروائی اختیار کرتا ہے، اس کی طرف تو توجہ کرتا ہے حالانکہ اگر وہ پاکیزگی اختیار نہ کرے تو تجھ پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تیرے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے اس سے تو بے رُخی برتتا ہے"۔

① پہلی گزارش یہ ہے کہ رسولؐ اعظم ہر چیز میں معصوم ہیں۔ یہ بات دلیل قطعی سے ثابت ہے اور اب اگر اس کے بعد کچھ ایسی آیات دکھائی دیں جو عصمت رسولؐ کے خلاف نظر آتی ہوں تو ہمیں رسولؐ اعظم کو غیر معصوم سمجھنے کی بجائے اپنی کوتاہی علم اور دانش کی کمی کا اعتراف کرنا چاہیے اور اس صورت میں ہمیں اشتباہ کے مصدر و منبع کو تلاش کرنا چاہیے۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ہمارا فریضہ یہ ہے کہ اس کے علم کو اس کے اہل کی طرف لوٹا دینا چاہیے۔ اپنی کم فہمی کی وجہ سے رسولؐ اعظم کو غیر معصوم تصور نہ کریں۔

② جب بھی نصوصِ قرآن کی سمجھ نہ آرہی ہو تو پھر آئمہ ہدیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ اہلِ بیت نبوت، معدن رسالت اور ملائکہ کی آمد و رفت کا مقام ہیں۔ خدا نے ان کے گھر میں اُتارا تھا اور انھیں وارثانِ کتاب کا درجہ دیا۔

چنانچہ جب ہم ان آیات کے لیے ائمہ ہدیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو انھوں نے فرمایا: یہ آیات حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق نازل نہیں ہوئیں۔ ان آیات میں بنی اُمیہ کے ایک شخص کی روش کی مذمت کی گئی ہے۔ کچھ روایات میں بنی اُمیہ سے تعلق رکھنے والے اس شخص کے نام کی بھی نشان دہی کی گئی

ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: تفسیر قمی، جلد۲/ ۴۰۵، تفسیر البرہان، جلد۴/ ۴۲۸، تفسیر نور الثقلین، جلد۵/ ۵۰۸-۵۰۹۔ مجمع البیان، جلد۱۰/ ۴۳۷)

طبری لکھتے ہیں: امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جب بھی ابن اُم مکتوم آئے تو آپؐ اسے دو بار خوش آمدید کہتے اور پھر فرماتے کہ خدا تیرے متعلق مجھے کبھی عتاب نہیں کرے گا۔

یہ حدیث بیان کرتی ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے ان الفاظ سے اپنے ایک صحابی کے طرز عمل پر تنقید کی۔ جس نے ایک بار دیکھا کہ رسولؐ خدا کے پاس قریش کے معززین جمع ہیں۔ اس اثنا میں عبداللہ بن اُم مکتوم صحابی جو کہ نابینا تھا اپنے عصا کا سہارا لے کر آنحضرتؐ کے پاس آنے لگا۔

بنی اُمیہ کے اس شخص کو اس وقت ایک غریب نابینا کی آمد پسند نہ آئی۔ چنانچہ اس نے اسے دیکھ کر منہ بسور لیا اور بے رُخی برتی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ عمل پسند نہ آیا اور خداوند عالم نے سورۂ عبس کی پہلی دس آیات نازل فرمائیں۔

اس کے بعد آنحضرتؐ ابن اُم مکتوم سے فرمایا کرتے تھے کہ خدا مجھے تیرے متعلق کبھی بھی عتاب نہیں کرے گا۔ مقصد یہ تھا کہ میں تجھ سے نہ تو اموی جیسا سلوک کروں گا اور نہ ہی خدا مجھ پر عتاب کرے گا۔

۳ جن روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابن اُم مکتوم کو دیکھ کر رسولؐ خدا نے منہ بسورا تھا اور انھوں نے بے رُخی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس پر اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن روایات میں یہ عمل حبیبؐ خدا سے منسوب کیا گیا ہے وہ تمام تر روایات مذہب اہل سنت کی ہیں۔ ان میں ایک شیعی روایت بھی نہیں ہے۔

رازی نے جملہ روایات کو اخبار احاد کہہ کر رد کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ روایات

جہاں احاد ہیں وہاں عصمتِ رسولِ اعظمؐ کے عقلی قواعد کے بھی خلاف ہیں لہٰذا یہ روایات نا قابلِ قبول ہیں۔ (عصمت الانبیاؑ، رازی)

ہم نے اپنی کتاب الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم کی جلد دوم کے ص ۱۵۵ سے ۱۶۵ تک اس عنوان پر تفصیلی بحث کی ہے۔

۴ سورۂ عبس کی مذکورہ آیات میں ایسے الفاظ موجود ہی نہیں ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ رسولؐ خدا نے اندھے کو دیکھ کر منہ بسور لیا تھا اور بے رُخی برتی تھی۔

جب قرآنِ حکیم میں اس واقعہ کو رسولؐ خدا سے منسوب نہیں کیا گیا تو افرادِ اُمت کو نبی اکرمؐ پر اس تہمت لگانے کا اشتیاق کیوں ہے؟

۵ آیاتِ مجیدہ میں یہ بیان کیا گیا ہے: اس نے منہ بسور لیا اور بے رُخی اختیار کی۔ اس کے پاس ایک نابینا آیا۔ اس کے بعد اللہ نے صیغہ غائب کو صیغہ حاضر سے تبدیل کیا اور فرمایا: وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى ۔ تجھے کیا معلوم ہے کہ شاید وہ پاکیزگی اختیار کرے۔

غائب سے حاضر کی طرف التفات کا وہی انداز ہے جو کہ سورۂ مبارکہ الفاتحہ میں ہے۔ اس میں پہلے اللہ کی حمد کی ہے اور کہا گیا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○

یہاں تک صیغہ غائب ہے۔ پھر اچانک غائب سے حاضر کی طرف التفات ہوا اور فرمایا: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○

واضح رہے کہ عَبَسَ وَتَوَلّٰى ○ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى میں بھی بات غائب کی ہوئی ہے۔ پھر اچانک غائب سے حاضر کی طرف التفات کرتے ہوئے فرمایا: وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى لیکن صیغہ حاضر کا خطاب رسول اکرمؐ سے نہیں ہے۔ یہ خطاب اسی سے ہے جس نے نابینا کو آتا دیکھ کر منہ بسورا تھا اور بے رُخی کی تھی۔ خدا نے اسے

خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تو نے جو بے رُخی کی ہے اور منہ بگاڑا ہے آخر تجھے کیا معلوم ہے کہ آنے والا معذور شخص تزکیہ نفس کا خواہش مند ہو۔ آخر مجھے کیا پڑی تھی کہ تو نے اسے محفلِ رسولؐ سے دھتکارا۔ تو اسے بیٹھنے دیتا تاکہ وہ رسولِ اعظمؐ کی باتیں سنتا۔ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى "وہ نصیحت حاصل کرتا اور وہ نصیحت اس کے لیے سود مند ثابت ہوتی"۔

بعدازاں اللہ نے منہ بگاڑنے والے کی عادات کو واضح کیا کہ یہ وہ شخص ہے جو دولت مندوں کے سامنے بچھ بچھ جاتا ہے اور ان کی خدمت کرنا چاہتا ہے لیکن اسے اس بات کی ہرگز پرواہ نہیں ہے کہ دولت مند تزکیہ نفس کے بھی خواہش مند ہیں یا نہیں ہیں۔ یہ شخص فقط ان کی دولت کو ہی مدنظر رکھتا ہے۔

وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى مقصد یہ ہے کہ دولت مندوں کا احترام کرنے والے شخص کی نظر میں ان کے انحراف کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اسے اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ وہ گمراہی چھوڑ کر ہدایت کا راستہ اپنائیں۔ چنانچہ منہ بسورنے والے سے خدا نے یہ فرمایا: اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى یعنی "اس شخص کا بس ایک ہی کام ہے کہ وہ دولت مندوں کے سامنے نیازمندی کا اظہار کرتا ہے اور اسے کسی غریب اور مومن شخص کی اصلاح کی کوئی فکر نہیں ہے"۔

وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى

"اور جو شخص خوفِ خدا رکھ کر دوڑتا ہوا تیرے پاس آتا ہے تو تو اس سے بے توجہی کرتا ہے"۔

آیاتِ بالا میں منہ بسورنے والے شخص کے کرداروں کو واضح کیا گیا ہے:

① دولت مندوں کی تواضع کرنا۔

② غریب و معذور اشخاص کو دیکھ کر منہ بگاڑ لینا۔

اس بات سے پوری دنیا آگاہ ہے کہ رسولؐ خدا میں مذکورہ دونوں عادات موجود نہیں تھیں۔ آپ تو ہر مسلمان کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آتے تھے۔

۵ سورۂ عبس کے نزول سے دو سال قبل اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا تھا:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (الشعراء:۲۱۵)

"جو بھی مومن آپ کی پیروی کرے آپ اس کے لیے اپنے کندھوں کو جھکا دیں"۔

مقصد یہ ہے کہ اس سے پیار و محبت کا برتاؤ کریں۔

جو لوگ سورۂ عبس کو رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص قرار دیتے ہیں ان سے ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ خدارا! ہمیں یہ سمجھائیں کہ کیا رسولؐ خدا کو خدا کا پڑھایا ہوا سبق نعوذ باللہ فراموش ہو چکا تھا کہ آپ ایک مومن کو دیکھ کر منہ بسورنے لگتے تھے؟!

۶ اس سلسلہ کی آخری گزارش یہی ہے کہ نبی اکرم من کل الوجوہ معصوم تھے۔ اگر اس کے باوجود ہم یہ کہیں کہ سورۂ عبس کی پہلی دس آیات کا روئے سخن آنحضرتؐ سے ہے تو پھر ہم اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے خاموش ہو جائیں گے اور آیاتِ الٰہی کا علم خدا اور اس کے رسولؐ اور وارثانِ کتاب کے سپرد کردیں گے۔ لیکن نبی اکرم کو غیر معصوم کہنے کی جسارت نہ کریں گے۔

کیا رسولِ اکرمؐ پہلے گمراہ تھے؟

سوال جناب عالی! قرآن مجید کی سورہ والضحیٰ میں ارشاد خداوندی ہے: وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ جس کا لفظی اور ظاہری معنی یہ دکھائی دیتا ہے کہ خدا نے آپ کو گمراہ پایا تو ہدایت دی۔

سوال یہ ہے کہ آنحضرتؐ کس دور میں گمراہ تھے اور کیا یہ کہنا

درست ہے کہ آپ اعلانِ نبوت سے قبل گمراہ تھے، پھر اللہ نے
کتاب وحکمت نازل کرکے آپ کو ہدایت عطا کی تھی؟!

جواب سورہ والضحیٰ کی تین آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم کو اپنے تین احسانات یاد دلائے ہیں۔ یہ آیت دوسری آیت ہے۔ اس آیت کو سمجھنے کے لیے اس سے پہلی اور اس کے بعد والی آیات کا سمجھنا ضروری ہے اور جب اس کی ماقبل اور مابعد آیات سمجھ میں آجائیں گی تو یہ درمیانی آیت بھی سمجھ میں آجائے گی۔

اس سے پہلی آیت یہ ہے: اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (الضحیٰ:۶) ''کیا خدا نے تجھے یتیم نہیں پایا کہ ٹھکانا دیا''۔

اس آیت مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ جیسے ہی آپؐ کے والد ماجد حضرت عبداللہ کی وفات ہوئی اور آپؐ یتیم بنے تو اللہ نے اسی وقت سے ہی آپ کو ٹھکانا فراہم کردیا تھا۔

جیسے ہی خدا نے آپ کو یتیم پایا تو پناہ فراہم کی۔ واضح رہے کہ ہمارے پانے اور خدا کے پانے میں واضح فرق ہے۔ جب ہم کسی چیز کو پاتے ہیں تو ایک عرصہ کے بعد پاتے ہیں جب کہ خدا سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ جیسے ہی کوئی چیز وجود میں آتی ہے تو خدا اسے پالیتا ہے۔ اس میں ذرہ برابر بھی تاخیر نہیں ہوتی۔ چنانچہ جیسے ہی آنحضرتؐ کے والد ماجد کی وفات ہوئی تو خدا نے آپ کو یتیم پایا۔ حضرت عبداللہ کی وفات اور خدا کی طرف سے آپ کو یتیم پائے جانے میں کوئی فاصلہ نہیں تھا۔

اور جیسے ہی خدا نے آپ کو یتیم پایا تو فوراً پناہ دی۔ ایسا نہیں ہے کہ آپؐ ایک عرصہ تک یتیمی کی حالت میں بے آسرا رہے ہوں۔ پھر کچھ عرصہ بعد خدا نے آپ کو سہارا دیا ہو۔ پھر وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کی آیت مجیدہ کے فوراً بعد فرمایا: وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ''خدا نے آپ کو ضرورت مند پایا تو غنی کردیا''۔

"عائل" سے ضرورت مند شخص مراد ہوتا ہے اور ہر انسان کی ضروریات کا دائرہ علیحدہ ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کے کندھوں پر بھاری ذمہ داریاں تھیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق آپؐ کی ذات سے تھا اور کچھ کا تعلق دوسروں سے تھا۔

آپؐ پر ہدایت کی بھاری بھرکم ذمہ داریاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ میرے حبیب پر بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ ہے اور وہ انھیں میری نعمات و الطاف کی اشد ضرورت ہے۔ اسی لیے اللہ نے آپ کو اپنے فضل سے آپ کو مالا مال کر دیا۔ جس سے آپ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے قابل بنے۔

آپ کی ذمہ داریوں کی ابتدا اعلانِ نبوت سے نہیں ہوئی تھی۔ آپ کی ذمہ داریوں کی ابتدا اس وقت سے ہو گئی تھی جب آپ نورانی شکل میں عرش کے ساتھ معلق تھے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ثم اغنیٰ نہیں فرمایا کہ ضرورت مندی اور مالا مال ہونے کے درمیان کچھ فاصلہ لازم آتا۔ اس کی بجائے اللہ نے حرف "فا" استعمال کیا جو کہ فوریت پر دلالت کرتا ہے۔ مقصد آیت یہ ہے کہ جیسے ہی اللہ نے آپ کو ضرورت مند پایا تو فوراً اور بلا فصل آپ کو مالا مال کر دیا۔

اب ان دونوں آیات کے درمیان میں موردِ بحث آیت شامل ہے۔ اللہ نے فرمایا: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى

ہمارے سابقہ بیان سے اس آیت کا مفہوم کافی حد تک واضح ہو جاتا ہے کہ جب خدا نے اپنے نبی کی روح پیدا کی۔ پھر جب روح کے ساتھ بدن کو شامل کیا تو خدا نے یہ دیکھا کہ میرا حبیب تمام مراحل وجود میں مختلف قسم کی ہدایات کا ضرورت مند ہے۔ اللہ نے بلا فاصلہ آپ پر ہدایات کا فیضان کیا اور خدا کی طرف سے آپ کی رہنمائی میں ایک منٹ کا بھی فرق نہیں آیا کیونکہ قرآن کریم میں ثم ھدیٰ کے الفاظ نہیں جس سے یہ سمجھا جائے کہ آپ کو ایک عرصہ بعد ہدایت کی گئی۔ اس کی بجائے

اللہ نے فَھَدیٰ فرمایا ہے۔

مقصد یہ ہے جیسے ہی آپ کو ہدایت تکوین کی ضرورت پڑی تو خدا نے بلا فاصلہ آپ کو ہدایت تکوینی عطا کی اور جب آپ کو ہدایت فطرت کی ضرورت پڑی تو آپ کے پروردگار نے آپ کو ہدایت فطری عطا کی اور جب آپ کو ہدایت عقلی کی ضرورت پڑی تو خدا نے بلا فاصلہ آپ کو ہدایت عقلی عطا کی اور جب آپ کو ہدایت شریعت والہام و وحی کی ضرورت پڑی تو خدا نے آپ پر اس ہدایت کا فیضان کیا۔

اور ان ہدایات کا اثر آپ کے مراتبِ کمال و قرب میں دیکھا جاسکتا ہے۔

الغرض خدا نے آپ کو ہر قدم پر ہدایت عطا کی اور آپ کبھی گمراہ نہیں رہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ پہلے آپ گمراہ ہوں۔ پھر آپ کو ہدایت ملی ہو۔

اس آیت مجیدہ میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ عوام الناس کو نبی اکرمؐ پر خدائی ہدایات و نعمات اور تفضلاتِ الٰہی کے مفہوم کو سمجھایا جائے۔

ہماری اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ اس بات کی دلیل ہے کہ خداوند عالم نے اپنے حبیب کریم کو ایسی تمام ہدایات سے نوازا جس کی آپ کو ضرورت تھی اور ان ہدایات میں الہام، وحی اور شریعت کی بھی ہدایت شامل تھی۔

سورۂ مبارکہ النجم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب سے ہر طرح کی گمراہی کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ○ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ○ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم:۴)

"ستارے کی قسم! جب وہ جھکا تمہارا ساتھی نہ تو بہکا اور نہ ہی بھٹکا، وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتا وہ تو ایک وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے"۔

چنانچہ سورۂ نجم کی یہ آیات اس حقیقت کی مظہر ہیں کہ آنحضرتؐ کبھی بھی اور کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ گمراہ نہیں ہوئے تھے۔

آنحضرتؐ کی عصمت آپؐ کی اس حدیث سے بھی ثابت ہوتی ہے:

کنت نبیا و آدم بین الماء والطین (الغدیر، جلد۹/۲۸۷)

"میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ مٹی اور پانی میں تھے"۔

بحارالانوار میں مرقوم ہے: وقت ولادت بھی آپؐ نبی تھے۔ (ملاحظہ فرمائیں: بحارالانوار، جلد۱۸/۲۷۷ تا ۲۸۱)

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام نے عصمت پیغمبرؐ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

...... ولقد قرن الله به صلی الله علیه وآله وسلم من لدن ان کان فطیما اعظم ملك من ملائکته یسلك به طریق المکارم ومحاسن اخلاق العالم لیله ونهاره (نہج البلاغہ، جلد۲، خطبہ قاصعہ سے اقتباس، الیقین للسید ابن طاؤس، ص۱۹۶)

اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی سے ایک عظیم فرشتے کو آپ پر مقرر کر دیا تھا جو آپ کو دن رات اخلاقِ عالیہ پر گامزن رکھتا تھا"۔

حضرت علی علیہ السلام کے ان کلمات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی نظر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کی بڑی اہمیت تھی اسی لیے اس نے اپنے ایک عظیم فرشتے کو آپ کی نگہبانی پر مقرر کیا تھا۔

حضرت نوح ولوط علیہم السلام کی بیویوں کی خیانت

سوال جناب عالی! قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا ......

(سورۂ تحریم)

"اللہ کافروں کے لیے مثال بیان کرتا ہے، نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کی، وہ دونوں ہمارے صالح بندوں کی بیویاں تھیں۔ انھوں نے ان سے خیانت کی"۔

تفسیر قمی میں اس آیت مجیدہ کے ضمن میں لکھا ہے کہ خیانت سے "فاحشہ" یعنی بدکاری مراد ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا کسی بھی نبی کی بیوی بدکار اور بدچلن ہو سکتی ہے؟

جواب تفسیر قمی پر اعتماد کرنا درست نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کے مؤلف علی بن ابراہیم ثقہ انسان تھے لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ "ابوالجارود" کے اقوال کو اس میں شامل کر دیا گیا جب کہ ابوالجارود مطعون اور مذموم شخص ہے اور اس کی روایت پر اعتماد کرنا درست نہیں ہے۔

تفسیر قمی کے صرف ان مقامات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جن کے متعلق یقین ہو کہ یہ الفاظ علی بن ابراہیم کے ہی ہیں۔ لیکن اس پر بھی اندھا اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس روایت کی سند اور متن کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حد تک درست ہے۔ اگر کوئی روایت ازروئے سند و متن صحیح ہو تو پھر اسے تسلیم کرنا چاہیے۔

جہاں تک لفظ "فاحشہ" کا تعلق ہے تو یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ قمی مرحوم کا جملہ ہے یا ابوالجارود کا جملہ ہے۔ اور اس جملے کی نسبت بھی کسی امام معصومؑ کی طرف موجود نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ ابوالجارود یا مرحوم قمی کی ذاتی رائے ہو۔

اہلِ بیتؑ طاہرین سے منقول روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت لوطؑ

کی بیوی کا کردار یہ تھا کہ جب بھی حضرتؑ کے پاس مہمان آتے تو وہ زور سے سیٹی مار کر بدکار لوگوں کو مہمانوں کی آمد کی اطلاع کرتی تھی۔ جب بدکار لوگ سیٹی کی آواز سنتے تو وہ دوڑے چلے آتے تھے۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویاں منافق تھیں۔ (التبیان، جلد ۱۰/۵۲)

حضرت نوحؑ کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ وہ اپنے شوہر کے متعلق لوگوں سے کہتی تھی کہ یہ پاگل ہے۔ ورنہ کسی بھی نبی کی بیوی عصمت فروش نہیں ہوتی۔ البتہ وہ دین میں خائن ہو سکتی ہے۔ (التبیان، جلد ۱۰/۵۲، بحارالانوار، جلد ۱۱/ ۳۰۸، امالی سید مرتضیٰ، جلد ۲/۱۴۵)

علامہ مجلسی رقم طراز ہیں: تمام عامہ و خاصہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ ازواج رسول کا دامن بے حیائی اور بدکاری سے پاک ہے۔ (بحارالانوار، جلد ۲۲/۲۴۰)

شیخ طوسی لکھتے ہیں کہ کسی بھی نبی کی بیوی نے زنا نہیں کیا تھا...... جو شخص کسی بھی نبی کی بیوی کی طرف اس فعلِ بد کی نسبت دے تو اس سے بہت ہی بڑی خطا صادر ہوئی ہے۔ کوئی بھی صاحبِ ایمان یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ (التبیان، جلد ۱۰/۵۲)

اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج سے خطاب کر کے فرمایا:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ○

"اے ازواج نبیؐ! تم میں سے جس کسی نے بھی واضح بدکاری کی تو اس کے لیے عذاب دگنا کر دیا جائے گا اور یہ اللہ کے لیے انتہائی آسان ہے"۔ (احزاب:۳۰)

واضح رہے کہ اس آیت میں ازواج نبی سے "فاحشہ" کی نفی نہیں کی گئی اور بتایا گیا ہے کہ ان سے "فاحشہ" کا امکان ہے لیکن انھیں خبردار کیا گیا کہ جو بھی ایسا کرے گی اس کے لیے دگنا عذاب ہوگا۔

قمی نے اپنے اسناد سے حریز سے نقل کیا کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا: فاحشه مبینه سے کیا مراد ہے؟

آپؑ نے فرمایا: اس سے تلوار لے کر خروج کرنا مراد ہے۔

ممکن ہے کہ قمی نے "خیانت" سے جو لفظ "فاحشہ" مراد لیا ہے اس لفظ سے ان کا صرف یہی مقصود ہو کہ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں نے اپنے حدود کی پاسداری نہیں کی تھی۔

معراج روحانی تھی یا جسمانی

سوال جناب عالی! واضح کریں کہ آنحضرتؐ کو جسم و روح سمیت معراج کرائی گئی تھی یا صرف آپ کی روح کو ہی معراج نصیب ہوئی تھی؟ جسمانی معراج کا بی بی عائشہ نے انکار کیا تھا، لہٰذا بی بی کی روایت کی موجودگی میں ہم جسمانی معراج کا عقیدہ کیسے رکھ سکتے ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو قرآن کریم میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا ...... (بنی اسرائیل: آیہ ۱)

"وہ ذات پاک ہے جس نے رات کے وقت اپنے "عبد" کو سیر کرائی"......

واضح رہے کہ لفظ "عبد" کا اطلاق جسم و روح دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ صرف روح پر نہیں ہوتا۔

آنحضرتؐ کے اس سفر کو عموماً طور پر لفظ "معراج" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور معراج کے لیے جسم و روح دونوں کا ہونا ضروری ہے۔

ایک حدیث پاک میں کہا گیا ہے: الصلاة معراج المؤمن "نماز مومن کی معراج ہے"۔

کیا نماز صرف روح سے پڑھی جاتی ہے یا جسم کا ہونا بھی ضروری ہے؟

سیدھی سی بات ہے کہ نماز کے لیے روح اور جسم دونوں کی ضرورت ہے۔ معلوم ہوا کہ معراج ہوتی ہی تب ہے جب جسم اور روح دونوں موجود ہوں۔

اگر معراج کو صرف روح سے ہی مخصوص کر دیا جائے تو پھر اس سے آنحضرتؐ کی کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوگی کیونکہ روحانی معراج کے دعوے دار تو بیسیوں افراد ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک بی بی عائشہ کی روایت کا تعلق ہے تو یہ روایت صریحاً جھوٹ پر مبنی ہے کہ شب معراج میں نے جسم محمدؐ کو مفقود نہیں پایا۔ یعنی ساری رات آپؐ بستر پر میرے ساتھ لیٹے رہے۔

یقیناً یہ روایت جھوٹ کا پلندہ ہے اور یہ نہ صرف رسول اکرمؐ بلکہ بی بی صاحبہ پر بھی افترا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ معراج مکہ میں ہوئی تھی اور بی بی صاحبہ کی رخصتی مدینہ میں ہوئی تھی۔ جب بی بی کی رخصتی ہی نہیں ہوئی تو بستر ایک کیسے تھا؟!!

یقیناً یہ روایت کسی دشمن دین کی وضع کردہ ہے۔

✲ ✲ ✲

ساتواں حصّہ

قرآنیات

موردِ انطباق کی تفسیر صحیح نہیں ہے

سوال کتب تفسیر میں ہم اس طرح کے الفاظ دیکھتے ہیں کہ اس کا تعلق باب انطباق سے ہے، یا اس کا تعلق باب الجری سے ہے، یا اس کا تعلق باب تفسیر سے ہے اور باب انطباق سے نہیں ہے۔ التماس ہے کہ اس کی کچھ وضاحت فرمائیں۔

جواب تفسیر قرآن کے مقصود اور ان معانی کے بیان کا نام ہے جس پر اس کے الفاظ دلالت کرتے ہوں۔ اور مفسر وہ ہے جو مختلف دلالات کو مدنظر رکھ کر قرآن کی آیات کی تشریح کرے اور معانی کے ارتباط کا من کل الوجوہ جائزہ لے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی مورد کے کچھ جہات پر آیت دلالت کرتی ہے جب کہ آیت کا مفہوم اس سے کہیں وسیع وعریض ہوتا ہے اور اس مورد میں تمام جہات شامل نہیں ہوتے۔

چنانچہ ایسے ہی موقع پر مفسرین یہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت اس مورد پر منطبق ہوتی ہے لیکن اس مورد کو من کل الوجوہ اس کی تفسیر نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آیت میں اور جہات میں شامل ہوتی ہیں جو کہ موارد انطباق میں موجود نہیں ہوتیں۔

سوال مفسرین کے ہاں ایک مشہور جملہ پایا جاتا ہے کہ "زمانہ قرآن کی تفسیر کرتا ہے" ــــ آخر اس جملہ کا کیا مفہوم ہے؟

جواب قرآن مجید صرف اپنے زمانہ نزول کی ضروریات کی تکمیل کے لیے نازل نہیں ہوا تھا۔ قرآن ہر زمانہ کے لیے رہنما بن کر نازل ہوا اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا قرآن کے معانی ومفاہیم دنیا کے سامنے منکشف ہو کر آتے جائیں گے۔

قرآن کریم کی کچھ آیات ایسی بھی ہیں جو کہ زمانہ نزول کے افراد کی سمجھ سے بالا تھیں لیکن موجودہ دور میں انھیں سمجھنا آسان ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَّ الْخَیْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِیْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِیْنَةً وَ یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (النحل:۸)

"گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کیے تا کہ تم ان پر سواری کرو اور زینت حاصل کرو۔ خدا ایسی سواریاں پیدا کرے گا جنھیں تم نہیں جانتے"۔

زمانہ نزول کے وقت گھوڑے، خچر اور گدھے سواری کا کام دیتے تھے اور اس وقت کے لوگ ان سے واقف تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ پھر اللہ نے فرمایا: خدا تمھارے لیے ایسی سواریاں پیدا کرے گا جنھیں تم نہیں جانتے۔

موجودہ دور کی سواریاں جن میں ہوائی جہاز، موٹر کاریں، بسیں اور ٹرینیں وغیرہ شامل ہیں اس زمانہ میں موجود نہ تھیں۔ یہ قرآن کی ابدی صداقت ہے کہ اس نے ان سواریوں کے متعلق پہلے سے اشارہ کیا تھا تو قرآن کی اس آیت کی تفسیر وقت اور زمانہ کے ذریعہ سے ہوئی ہے۔

اسی طرح سے قرآن کریم میں فرعون سے یہ خطاب ہے:

فالیوم ننجیك ببدنك لتكون لمن خلفك ایة

"آج ہم تیرے جسم کو نجات دیں گے تا کہ تو آنے والوں کے لیے عبرت بن جائے"۔

قرآن کریم کے زمانہ نزول میں فرعون کی لاش دنیا کے سامنے موجود نہ تھی۔ ایک طویل عرصہ بعد اس کی لاش دریافت ہوئی اور یوں وقت اور زمانہ نے قرآنی آیت کی تفسیر لوگوں کے سامنے پیش کر دی۔

تقویٰ اور فہم قرآن

سوال جناب عالی! روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ گناہوں سے اجتناب کی وجہ سے قرآن کے معانی سمجھنے کی قدرت پیدا ہوتی ہے؟ آخر اس جملہ کا کیا مقصد ہے؟

جواب معرفت و پہچان کے وسائل مختلف ہیں مثلاً سردی گرمی کا احساس جسم سے ہوتا ہے اور خوشبو بدبو کا احساس ناک سے ہوتا ہے، رنگوں کی پہچان آنکھ سے ہوتی ہے۔

اس میں تمام انسان بلکہ جانور بھی یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ عالم محسوس سے ہٹ کر کچھ ایسے امور بھی ہیں جن کا ادراک انسان اپنی عقل سے کرتا ہے۔ بعض اوقات براہِ راست ادراک حاصل ہوتا ہے اور کبھی استدلال سے کسی چیز کو محسوس کیا جاتا ہے۔

کچھ امور ایسے ہیں جن کا ادراک انسان اپنی فطرت یا تعلیم سے کرتا ہے۔ انسان کے اعمال دل اور نفس پر مثبت یا منفی اثرات پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے منفی اثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

"ہرگز نہیں، ان کے اعمال نے ان کے دلوں کو زنگ آلود کر دیا ہے"۔ (مطففین:۱۴)

اس کے برعکس کچھ اعمال ایسے بھی ہیں جو صفائے باطن اور تزکیہ نفس کا سبب

بنتے ہیں، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَ تُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ

"ان کے اموال سے زکوۃ لیں، انھیں پاک کریں اور اس کے ذریعہ سے ان کا تزکیہ کریں اور ان کے حق میں دعائے خیر کریں"۔ (التوبہ:۱۰۳)

الغرض قرآن کے بیان کے مطابق کچھ نیک اعمال ایسے بھی ہیں جن سے دلوں کو نورانیت حاصل ہوتی ہے اور ان سے دلوں کا زنگ ختم ہو جاتا ہے۔ اطاعت الٰہی سے دل شفاف ہوتا ہے اور ایمان وعملِ صالح سے آئینہ دل مصفّٰی ہوتا ہے۔ اسی لیے آئینۂ دل جتنا صاف ہوگا اتنا ہی معارف قرآنی کا اس پر جلوہ ہوگا۔

قرآن اور آیات متشابہات

سوال جناب عالی! قرآن کریم میں آیات متشابہات کیوں ہیں؟

جواب ہم نے اس سوال کا تفصیلی جواب اپنی کتاب "الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم" کی دوسری جلد میں دیا ہے۔ اور ہمارے اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے مخاطب عرب تھے اور قرآن عربی زبان میں نازل ہوا۔

عربی زبان کے الفاظ محسوس اشیاء یا محسوس سے قریب تر اشیاء کے لیے بنائے گئے ہیں، مثلاً: ہمیں اپنے اُوپر جو نیلا غلاف دکھائی دیتا ہے اس کے لیے عربی زبان میں "سماء" (آسمان) کا لفظ وضع کیا گیا ہے اور جس فرشِ خاکی پر ہم رہ رہے ہیں اس کے لیے "ارض" کا لفظ وضع کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے درخت کے لیے لفظ "شجر" تلوار کے لیے لفظ "سیف" اور گھوڑے کے لیے لفظ "فرس" وضع کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں محسوس اشیاء کے غیر محسوس آثار کے لیے بھی عربی زبان میں الفاظ

موجود ہیں، مثلاً کرم، خوف، عدالت، شجاعت وغیرہ۔

اسی طرح سے ہمارے ادراکات کے نتیجہ کو ظاہر کرنے کے لیے بھی مثلاً اوپر، نیچے، کل، جز، چھوٹا اور بڑے کے لیے بھی الفاظ موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارا خالق ہے اور قرآن مجید اس کی کتاب ہے۔ اللہ نے بہت سے معارف و مطالب کو قرآن میں بیان کیا لیکن یہاں زبان کا مسئلہ درپیش تھا۔ متکلم وہ ہے جس کے پاس جملہ معارف موجود ہیں اور کلام ایسی زبان میں کر رہا ہے جہاں مفہوم کی صحیح ادائیگی کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے بلند و بالا مفاہیم کو متداول زبان کے الفاظ، کنایات، مجازات، استعارات واشارات میں بیان کیا۔ کیونکہ عربی زبان میں اس سے زیادہ مطالب کے بیان کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

زبان کی محدودیت تشابہ کی وجہ بن گئی۔ اسی لیے آیات کا کچھ ظاہر ہے اور کچھ باطن ہے اور ان کے معانی و مفاہیم کے ادراک میں تمام افراد یکساں نہیں ہیں۔

اور آیات متشابہات کا اصول یہ ہے کہ جو آیت آپ کو سمجھ میں نہ آئے تو اس کی طرف رجوع کریں جو آپ سے بڑا عالم ہو۔ اور جب اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہو تو پھر "راسخین فی العلم" کی طرف رجوع فرمائیں۔

اور جب وہ کوئی جواب دے دیں تو اس پر اکتفا کرنا چاہیے اور ان کی بیان کردہ تشریح سب سے درست ہے کیونکہ خدا نے انھیں وارثانِ کتاب کا درجہ دیا ہے۔

متشابہ کی پہچان

سوال جناب عالی! کیا ایسا کوئی قاعدہ کلیہ بھی موجود ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ فلاں آیت متشابہ ہے؟

آخر ہم متشابہ کو پہچانیں تو کیسے پہچانیں؟

جواب جی ہاں، ثوابت قطعی کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کون سی آیت محکم ہے اور کون سی متشابہ ہے۔ ایسی تمام آیات متشابہ ہیں جن کے ظاہری الفاظ شریعت اسلامی کے بدیہیات اور عقل کے تقاضوں کے خلاف ہوں۔ مثلاً ایسی تمام آیات متشابہ ہیں جن سے خدا کی جسم وجسمانیت کا مفہوم مترشح ہوتا ہے مثلاً: يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح:۱۰) "ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے"۔ یا اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طٰہٰ:۵) "رحمٰن عرش پر متمکن ہوگیا"۔

عقلِ انسانی خدا کی تجسیم کو قبول نہیں کرتی اور عقل اس امر کو ناممکن قرار دیتی ہے کہ خدا کا کوئی جسم ہو اور وہ کسی مکان یا جہت میں محدود ہو۔ ایسے مواقع پر عربی زبان کے محاورات سے استفادہ کرنا چاہیے۔ عربی محاوروں میں لفظ "ید" (ہاتھ) کا اطلاق قدرت پر ہوتا ہے۔

اور لفظ "عرش" سے عرشِ اقتدار مراد لیا جاتا ہے۔ آیات محکمات کو میزان بنا کر آیاتِ متشابہات کو ان پر وزن کرنا چاہیے اور اگر عربی زبان کے محاورات کی طرف رجوع کرنے کے باوجود آیاتِ متشابہات سمجھ میں نہ آئیں اور آیاتِ محکمات کی طرف رجوع کرنے کے بعد بھی آیاتِ متشابہات کا مفہوم واضح نہ ہو تو پھر وارثانِ قرآن آئمہ آلِ محمدؑ کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اگر کسی آیت کے متعلق آئمہ سے بھی کوئی روایت نہ ملے تو پھر توقف کرنا چاہیے اور اس کا علم خدا کے سپرد کر دینا چاہیے۔

غیر عرب اور قرآن

سوال جناب عالی! قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا اور قرآن اسلام کا معجزہ ہے۔ عربی زبان بولنے والا تو قرآن کی فصاحت و بلاغت کو محسوس کرسکتا ہے جب کہ غیر عرب اشخاص اس کی فصاحت و بلاغت کو محسوس نہیں کرسکتے۔ سوال یہ ہے کہ

غیر عرب قرآن کو معجزہ سمجھیں تو کیسے سمجھیں؟

جواب یہ کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ اگر غیر عرب افراد عربی زبان سیکھ لیں تو وہ براہ راست اعجاز قرآن کا مشاہدہ کرسکیں گے۔ علاوہ ازیں اعجاز قرآن صرف فصاحت و بلاغت میں ہی منحصر نہیں ہے۔ اعجاز قرآن اس کے حقائق، اس کی تعلیمات، اس کی بیان کردہ تاریخ اور اس کی بیان کردہ پیشین گوئیوں میں بھی مضمر ہے۔ اگر ایک غیر عرب قرآن کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز کو محسوس نہیں کرسکتا تو کوئی حرج نہیں ہے۔ قرآن پھر بھی اس کے لیے اپنے حقائق اور تعلیمات کے لحاظ سے اس کے لیے معجزہ ہے۔

قرآن اور غیر عربی الفاظ

سوال جناب عالی! قرآن کریم کی متعدد آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآن خالص عربی زبان میں نازل ہوا۔ جب کہ علمائے لغت بیان کرتے ہیں کہ قرآن میں غیر عربی الفاظ بھی پائے جاتے ہیں مثلاً سندس، استبرق، سجیل وغیرہ جیسے الفاظ عربی زبان کے نہیں ہیں۔ اس کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟

جواب اس سوال کے جواب میں ہم یہ معروضات پیش کرتے ہیں:

① ہم ان لوگوں کے اس دعویٰ کو صحیح نہیں مانتے کہ یہ الفاظ عربی زبان کے نہیں ہیں۔ ان الفاظ کا قرآن میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ الفاظ عربی زبان کے ہیں۔

② اور اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ مذکورہ الفاظ عربی زبان کے نہیں ہیں تو اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان دوسری زبان کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اور جب ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں اچھی طرح سے جذب ہو جائے تو پھر

اس کی نسبت سابقہ زبان کی طرف نہیں دی جا سکتی۔

۴ علاوہ ازیں ہر قاعدہ کلیہ کے بعد کچھ شواذ بھی ہوتے ہیں جو کہ قاعدہ کلیہ سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ شواذ کی تعداد انتہائی قلیل ہوتی ہے۔ اس سے کوئی قاعدہ متاثر نہیں ہوتا۔

قرآن میں اشخاص اور مقامات کے نام کیوں لیے گئے؟

سوال قرآن کریم میں ابولہب اور فرعون کے نام لیے گئے ہیں اور کعبہ اور مکہ جیسے مقامات کے نام بھی مذکور ہیں اور غزوات میں سے بدر و حنین کے نام بھی موجود ہیں۔
کیا جزئیات متعین کرنے کے بجائے اگر قرآن میں عمومی اور کلی قواعد ہوتے تو یہ زیادہ مناسب نہ ہوتا؟

جواب ہر انسان کی نظر پیکرِ محسوس کی خوگر ہے اور جب تک صفات کا پیکر پیش نہ کیا جائے اس وقت تک بات سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ فرعون سرکشی کا پیکر ہے۔ ابلیس مکر و فریب کا پیکر ہے۔
یاد رکھیں جب تک سامنے نمونہ موجود نہ ہو تو ذرا ایمان بالغیب کافی مشکل ہو جاتا ہے۔

خلقتِ انسان سے پہلے تعلیم قرآن

سوال جناب عالی! قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:
اَلرَّحۡمٰنُ ○ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ○ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ○ عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ
”رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی، انسان کو پیدا کیا، اسے بیان کی تعلیم دی“۔ سوال یہ ہے کہ یہاں تعلیم قرآن مقدم ہے اور تخلیق

انسان مؤخر ہے تو تخلیق انسان سے قبل تعلیم قرآن کا کیا مفہوم ہوسکتا ہے؟

جواب امکانی طور پر اس سوال کے تین جواب ہوسکتے ہیں:

① اس آیت مجیدہ میں اللہ نے صرف اپنے معلمِ قرآن ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں کسی متعلم کی بات نہیں ہے اور کائنات کو یہ باور کرایا ہے کہ تعلیم قرآن تخلیقِ انسان سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اگر انسان ہو اور قرآن نہ ہو تو پھر انسانی وجود کا نقصان اس کے فائدہ سے زیادہ ہے۔

اس سورہ میں اللہ نے سب سے پہلے اپنی عظیم نعمت تعلیم قرآن کا ذکر کیا، اس کے بعد تخلیق انسان اور اشیائے کائنات کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد میزان مقرر کرنے کا ذکر کیا تا کہ اس میزان پر انسان اللہ کی نعمات اور اپنے شکر کا وزن کرسکے۔

اس سورہ میں خدا نے بیان کیا کہ اس نے ہر چیز کو ایک دقیق نظام کے تحت پیدا کیا ہے۔ پھر خدا نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ کائنات کی تمام اشیاء میں شعور اطاعت کو ودیعت کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

والنجم والشجر یسجدان "ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں"۔

والشمس والقمر بحسبان "سورج اور چاند ایک دقیق حساب کے پابند ہیں"۔

ان تمام آیات سے قانون الٰہی کی ضرورت کو واضح کیا ہے اور وہ قانونِ الٰہی قرآن سے عبارت ہے۔ اسی لیے اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

② قرآن ہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جس سے کائنات کا ہر موجود اپنے کمالِ فطرت کو حاصل کرسکتا ہے۔ کائنات کے تمام موجودات کے لیے قرآن ہی عظیم ترین رحمت ہے۔ قرآن ہو تو سعادت ہی سعادت ہے اور اگر قرآن نہ ہو تو پھر شقاوت ہی شقاوت ہے۔ قرآن کے ذریعے سے انسان اور دیگر موجودات اپنی غایتِ خلقت کو

حاصل کرتی ہیں۔

قرآن کون و حیات کے نوامیس کی حفاظت کرتا ہے اور قرآن انسان کو کائنات کی آبادی کی ترغیب دیتا ہے اور فانی اور محدود انسان کا رشتہ باقی اور لامحدود خدا سے جوڑتا ہے۔

قرآن تمام کائنات کے لیے رحمت ہے کیونکہ قرآن جہالت و خواہشات کی غلامی سے بچاتا ہے۔

۳ تفسیر قمی میں مرقوم ہے کہ "علم القرآن" سے یہ مراد ہے کہ رحمٰن نے اپنے نبی کو قرآن کی تعلیم دی۔ بعض روایات میں مذکور ہے کہ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ سے حضرت علی علیہ السلام مراد ہیں۔

ہمیں یہ بات کبھی بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے پنجتن پاکؑ کے ارواح و اشباح کو مخلوقات کی تخلیق سے پہلے پیدا کیا تھا اور اسی عالم میں خدا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن کی تعلیم دی تھی۔ اور یہی چیز اس عالم میں ذواتِ طاہرہ کے مراتب قرب کا ذریعہ بنی۔ چنانچہ ان ذواتِ قادسہ و مقدسہ کو خدا نے اتنا بڑا مقام عطا کیا کہ انبیاء اللہ تعالیٰ کو ان کا واسطہ دیتے تھے اور ان کے طفیل اللہ انبیاء کی مشکلات کو دور کرتا تھا اور ذواتِ طاہرہ کے تصدق میں انبیاء مقامات و برکات حاصل کرتے تھے۔

خالدین فیھا

سوال جناب عالی! اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے:

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ (ھود: ۱۰۷)

"وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین رہیں گے

سوائے اس کے جو تمہارا پروردگار چاہے"۔

اس آیت میں اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ کے الفاظ موجود ہیں جو کہ جنت و دوزخ کی عدم ہمیشگی پر دلالت کرتے ہیں اور آیت مجیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ جنت و دوزخ کی وہاں موجودگی تب تک رہے گی جب تک خدا چاہے گا پھر جب خدا ان کی ہمیشگی کا ارادہ ترک کرے گا تو اس میں زمین و آسمان قائم نہیں رہیں گے اور جب زمین و آسمان قائم نہ رہے تو ان کی ہمیشگی بھی ختم ہو جائے گی۔ التماس ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

جواب اس استثنا کا یہ تقاضا بھی ہے کہ عملی طور پر ان کی ہمیشگی ختم ہو جائے گی یہ استثنا عموم قدرت کو بیان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ذریعہ سے ہمیں یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ جو لوگ جنت و دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ اللہ کی مشیت اور اس کے فیصلے کے تحت رہیں گے۔ خدا انہیں جنت و دوزخ میں ہمیشہ رکھنے پر مجبور نہیں ہے اور خدا عاجز نہیں ہے۔ جب کہ یہودی یہ نظریہ رکھتے تھے کہ "خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں"۔ خدا نے جو فیصلے کرنے تھے وہ اس نے کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد خدا کے پاس کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہی نہیں ہے۔

اس آیت سے اللہ نے یہودیوں کے نظریہ کا ابطال کیا اور اس کے ساتھ یہودیوں کے ہم فکر افراد کے اس نظریہ کی بھی تردید کی ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے قلم پیدا کیا۔ پھر اسے حکم دیا کہ لکھ۔ چنانچہ قلم نے ہر چیز لکھ دی اور اب قلم خشک ہو چکا ہے اور اللہ اپنے لکھے کا پابند ہے، اب اسے فیصلہ تبدیل کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس کے برعکس خدا نے فرمایا ہے: یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ "خدا جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے"۔ وہ قادر اس کی قدرت لامحدود ہے، وہ عالم

ہے اور اس کا علم لامحدود ہے۔ لیکن اس کا علم اس پر حکمران نہیں ہے۔

الرحمٰن علی العرش استویٰ

سوال قرآن کریم میں فرمانِ خداوندی ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طٰهٰ:۵) "رحمٰن عرش پر متمکن ہو گیا"۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح:۱۰) "ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے"۔

آخر ان جیسی آیات متشابہات کی تاویل کیسے کی جائے گی؟ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ آیات کے ظاہری الفاظ سے تمسک انتہائی ضروری ہے۔ التماس ہے کہ آپ اپنے نظریے کو واضح فرمائیں۔ اس کے ضمن میں ایک سوال اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ "تاویل" سے کیا مراد ہے؟

جواب پہلے سوال کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ لفظ "فسر" کے معنی اظہار و بیان کے ہیں اور کسی چیز سے پردہ اٹھانے کے ہیں اور لفظ "فسّر" جب باب تفعیل میں آتا ہے تو اس میں مبالغہ کا وصف پیدا ہو جاتا ہے۔

علم تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں ظاہری الفاظ کے وسیلہ سے آیات قرآنی کے خصوصیات اور ان کے مقصود معانی کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

ادھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عربی لغت میں جہاں الفاظ حقیقی معانی میں استعمال ہوتے ہیں وہاں الفاظ کو مجازی معانی پر محمول کرنے کا بھی رواج موجود ہے۔ پھر مجاز کی کئی قسمیں ہیں جن میں مجاز لغوی، مجاز عقلی اور مجاز بالحذف زیادہ مشہور ہیں۔

علاوہ ازیں اس زبان میں کنایات، استعارات اور دلالت اقتضاء اور دلالت اشارہ بھی پائی جاتی ہے۔ علم معانی و بدیع میں اس پر مکمل بحث موجود ہے۔ اس تمہیدی گفتگو کے بعد ہم یہ کہتے ہیں: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طٰہٰ:۵) يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح:۱۰) وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (یوسف:۸۲) وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ○ وَجِایْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ (الفجر:۲۲-۲۳) اور وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (البقرہ:۴۳) کی آیات کا تعلق بھی اسی قسم سے ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ اگر ایک شخص آپ سے یہ کہے کہ "کل میں یزید بن معاویہ سے ملا تھا" حقیقت یہ ہے کہ یزید بن معاویہ لعین کو جہنم واصل ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ اب اس کلام سے اس کا حقیقی معنی مراد نہیں لیا جائے گا۔ اس کا مقصود یہ ہوگا کہ متکلم نے کس یزید صفت شخص سے ملاقات کی ہے۔

برادرانِ یوسفؑ نے اپنے والد سے کہا تھا: وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِىْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِىْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (یوسف:۸۲) "آپ اس گاؤں سے پوچھیں جہاں ہم تھے اور اس قافلہ سے پوچھیں جس کے ساتھ ہم آئے تھے، اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم سچے ہیں"۔

پوری توجہ فرمائیں: برادرانِ یوسفؑ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ گاؤں سے پوچھیں اور قافلہ سے پوچھیں۔

گاؤں کیا ہوتا ہے؟ چند مکانات کا مجموعہ، اور قافلہ کیا ہوتا ہے؟ چند مسافر افراد کا مجموعہ۔ جب کہا کہ آپ گاؤں سے پوچھیں تو مقصود یہ تھا کہ آپ اس گاؤں میں رہنے والوں سے پوچھیں اور جب کہا کہ قافلہ سے پوچھیں تو مقصد کیا تھا کہ قافلہ میں شریک مسافروں سے پوچھیں۔

اسی طرح سے جب قرآن نے کہا: وَّجَآءَ رَبُّكَ (تیرا رب آجائے گا)۔

اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ رب خود چل کر عرصۂ محشر میں آجائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ تیرے رب کا حکم آجائے گا۔ لہٰذا اس آیت کو محکم کے مقابلہ پر متشابہ نہیں سمجھا جاسکتا اور نہ ہی ظاہر کے مقابلہ پر اسے باطنی سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ مفہوم تو اتنا واضح ہے کہ ہر عرب اسے ایک مرتبہ سن کر ہی اس کا مفہوم سمجھ سکتا ہے۔

اسی طرح سے فرمانِ قدرت ہے: وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (اور نماز قائم کرو)۔

مقصود یہ ہے کہ ایسی نماز پڑھو کہ نماز مجسم ہوجائے اور انسانی رویوں میں اس کی جھلک دکھائی دے اور یوں لگے کہ وہ ایک وجودی چیز ہے اور اس کے برعکس ایسی نماز نہ ہو کہ جس کا وجود اور عدم وجود یکساں ہو اور انسانی حیات پر اس کا کوئی اثر نہ ہو۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (الفتح:۱۰) (ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے) یہ ایک ایسا کنایہ ہے جسے عرب اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اس سے قدرت، تسلط اور مالکیت مراد ہوتی ہے۔

عربی زبان کا مقولہ ہے: فلاں امسك بمفاتیح الحکم "فلاں شخص کے ہاتھ میں اقتدار کی چابیاں ہیں"۔ جب کہ یہاں بظاہر کوئی چابی ہوتی ہے اور نہ ہی کسی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہوتی ہے۔

اسی طرح سے ایک اور مقولہ ملاحظہ فرمائیں: فلاں یضرب بید من حدید "فلاں شخص فولادی اور آہنی ہاتھ سے مارتا ہے"۔ جب کہ کوئی ہاتھ نہ تو فولادی ہوتا ہے اور نہ ہی آہنی ہوتا ہے۔ اس سے مراد بھرپور قوت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: الم نشرح لك صدرك (الانشراح:۱) کیا ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ نہیں کیا؟

اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ پہلے رسول کریمؐ کا سینہ تنگ تھا، پھر لوہے کے اوزاروں سے اسے چیر پھاڑ کر وسیع کردیا گیا۔ جب کہ چند جاہل آج بھی اسی مفہوم پر

اصرار کر رہے ہیں۔ سینہ کی کشادگی کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو معارف الٰہی کا گنجینہ بنا دیا گیا ہے، یہ ایک کنایہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (القلم:۴۲)

''جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی اور سجدہ کے لیے بلایا جائے گا تو وہ سجدہ نہ کرسکیں گے''۔

''کشف ساق'' دراصل ایک محاورہ ہے۔ جب جنگ پورے زور شور سے جاری ہو تو عرب کہتے ہیں: قامت الحرب علی قدم وساق ''جنگ اپنے قدم اور پنڈلی پر کھڑی ہوگئی''۔

اس مراد جنگ کی آگ کا شعلہ ور ہونا ہے ورنہ جنگ کا نہ تو پاؤں ہوتا ہے اور نہ ہی پنڈلی ہوتی ہے۔ اسی مقولہ کے تناظر میں آیت مجیدہ کا معنی کرنا چاہیے کہ جب روزِ جزا پورے عروج پر ہوگا۔

آج بھی کچھ جاہل ایسے ہیں جو طبع زاد روایات کے تحت یہ باور کیے ہوئے ہیں کہ قیامت کے دن خدا انھیں اپنی پنڈلی دکھائے گا تو وہ اسے پہچان لیں گے۔ ایسے جُہال سے پوچھنا چاہیے کہ میاں کبھی پنڈلی سے بھی کسی کی پہچان ہوتی ہے۔ پہچان تو چہرے سے ہوتی ہے۔ پنڈلی دیکھنے کا آخر کیا مطلب ہے؟

اسی طرح سے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طٰہٰ:۵) ''رحمٰن عرش پر متمکن ہوا''۔ اس کا معنی یہ تھوڑی ہے کہ خدا جسم رکھتا ہے اور وہ دوسرے بادشاہوں کی طرح سے تخت پر بیٹھ گیا۔

اس آیت کا سیدھا سا مفہوم ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام موجودات پر خدا کی

حکومت واقتدار قائم ہے۔

عربی زبان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

قد استوی بشر علی العراق

من غیر قتل او دم مهراق

''بشر عراق پر چھا گیا نہ تو کوئی قتل کیا اور نہ ہی کوئی خون بہایا''۔

شعر کا یہ معنی نہیں ہے کہ بشر عراق پر بیٹھ گیا ہے۔ اور یہی حال وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ (الحاقہ:۱۷) کی آیت مجیدہ کا ہے۔

یہ سب کے سب کنایات ہیں اور مجاز واستعارہ ہیں۔ ان آیات کو متشابہ قرار دینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کنایہ کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس سے لفظی اور وضعی معانی مراد نہیں لیے جاتے۔

اور جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ تاویل آل یؤول سے ہے جس کا مقصد ہوتا ہے کہ حالات کی دگرگونی کے بعد جہاں آ کر معاملہ ٹھہر جائے۔

کبھی اس لفظ سے ایسے معانی مراد ہوتے ہیں جن کا امکانی طور پر احتمال موجود ہو اور اس کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب حقیقی معنی مراد لینا محال ہو جائے۔ کبھی اس لفظ سے یہ مراد ہوتی ہے کہ کسی لفظ کو دور دراز معانی میں استعمال کیا جائے تا کہ لوگوں کو اس سے گمراہ کیا جا سکے۔

اور وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ (آل عمران:۷) کی آیت مجیدہ میں لفظ ''تاویل'' پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

معصومین سے منقول ہے: نحن نتیقن تاویله ولا نتظنی۔ ہم یقینی تاویل جانتے ہیں، ہم کسی طرح کے ظن وتخمین سے کام نہیں لیتے۔

کبھی اس سے مرجع حقیقی کا معنی مراد ہوتا ہے۔ آلِ محمد تاویلِ قرآن کو صحیح انداز میں جانتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ فتنہ پیدا کرنے کے لیے آیاتِ متشابہات کی تاویل کرتے ہیں۔

کیا فنا صرف ذوی العقول کے لیے ہے؟

سوال جناب عالی! قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (الرحمٰن:۲۶) "جو بھی اس پر رہتا ہے فنا ہونے والا ہے"۔

عربی زبان میں لفظ "مَن" ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اگر ہر چیز نے فنا ہونا ہوتا تو اللہ تعالیٰ لفظ "مَن" کے بجائے لفظ مَا استعمال کرتا ہے۔ التماس ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

جواب جی ہاں یہ درست ہے کہ عام طور پر لفظ "مَن" صاحبانِ عقل کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ انسان، جنات اور ملائکہ ہیں۔ البتہ غیر ذوی العقول بر سبیل تغلیب یا تنزیل بمنزلۃ العقلاء کے تحت اس لفظ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جب کہ لفظ "ماہ" سے عمومی طور پر غیر ذوی العقول مراد ہوتے ہیں۔

اس آیت مجیدہ کا مفہوم یہی ہے کہ اس پر رہائش پذیر تمام صاحبانِ عقل فنا ہو جائیں گے اور ان کا کوئی نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔ البتہ انھوں نے رضائے الٰہی کے لیے جو کام کیے ہوں گے وہی باقی رہ جائیں گے۔

انسان اور کراتِ سماوی تک رسائی

سوال جناب عالی! قرآن کریم نے یہ اعلان کیا ہے کہ انسان

زمین و آسمان کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھتا جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

يَامَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا لَا تَنفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ ○ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ (الرحمٰن ۳۳-۳۵)

اے گروہ جن و انس! اگر تم زمین اور آسمانوں کے اطراف سے باہر نکلنے کی قوت رکھتے ہو تو نکل جاؤ لیکن تم قوت اور غلبہ کے بغیر نہیں نکل سکتے۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے۔ تمہارے اُوپر آگ کا سبز شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا تو تم دونوں کسی طرح نہیں روک سکتے ہو"۔

دورِ جدید میں ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ انسان چاند پر پہنچ چکا ہے اور زہرہ و مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے اور عین ممکن ہے کہ انسان کا قدم وہاں پر جا پہنچے۔ اب قرآن مجید کی اس آیت کی موجودگی میں ہم انسان کے خلائی سفر کی کیا توجیہہ کریں گے؟

جواب قرآن کریم عربی زبان میں ہے اور اس زبان کے الفاظ بنیادی طور پر محسوسات کے لیے وضع کیے ہیں یا محسوسات سے قریب ترین معانی کے لیے بنائے گئے ہیں مثلاً کرم، شجاعت، عدالت اور غضب وغیرہ۔

قرآن کریم انھی متداوّل الفاظ کو استعمال کر کے انسان کو ان کے اعلیٰ وارفع مقصود تک لے جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے قرآن کریم نے کنایات، استعارات، اشارات وتلمیحات کا استعمال کیا ہے۔

قرآن کریم نے جب کائنات کے حجم کو بیان کرنا چاہا تو کہا کہ کائنات دو طرح کی ہے: ایک طرف آسمان ہے اور دوسری طرف زمین ہے۔ ''آسمان'' کے لیے قرآن کریم میں ''سماء'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور یہ لفظ ''سمو'' سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ اس لحاظ سے سماء اس جرم کو کہا گیا ہے جو بلند ہو۔

پھر قرآن نے یہ پیغام دیا کہ بلند کرامت کئی طرح کے ہیں: ایک وہ ہے جسے قرآن نے السماء الدنیا کہا ہے، یعنی نزدیکی بلندی۔ اور کچھ کے لیے السماوات العُلیٰ ''بلند و بالا اور دور کے اجرامِ فلکی''۔

ہمیں رات کے وقت جتنے ستارے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سب کے سب سماء دنیا میں واقع ہیں جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (حم السجدہ:۱۲)

''ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے مزین کیا''۔

اس آیت سے یہ وہم ہو سکتا تھا کہ یہ آیت ان ستاروں سے مخصوص ہے جو رات کو چمکتے ہیں کیونکہ قرآن نے انھیں ''مصباح'' کہا ہے اور مصباح (چراغ) ہمیشہ تاریکی میں جلا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو دُور کیا اور عمومیت پیدا کی اور بیان کیا کہ تمام ستارے حتیٰ کہ سورج بھی آسمانِ دنیا ہی میں ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ (الصافات:٦)

''ہم نے آسمانِ دنیا کو کواکب کی زینت سے مزین کیا''۔

پہلی آیت میں لفظ ''مصباح'' استعمال ہوا ہے۔ اس سے یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ اس سے وہ ستارے سیارے مراد ہیں جن کا نور ذاتی ہے کیونکہ مصباح (چراغ) کا نور ذاتی ہوتا ہے۔ کسی دوسرے کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر اس مفہوم میں عمومیت پیدا کی اور سورہ الصافات کی مذکورہ آیت نازل فرمائی اور اس سے یہ پیغام دیا کہ تمام ستارے سیارے خواہ وہ رات کو نمودار ہوتے ہوں یا دن کو، ان سب کا تعلق ''آسمانِ دنیا'' سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو لفظ ''کواکب'' سے تعبیر کیا ہے اور اس کے ساتھ لفظ ''زینت'' کا سابقہ لگا کر یہ واضح کیا کہ یہ باعثِ زینت بھی ہیں اور ان کو دیکھنے سے لطف سا محسوس ہوتا ہے۔

اب اگر ہم جدید معلومات کی طرف رجوع کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ علم الافلاک کے ماہرین یہ کہتے ہیں کہ خلا میں ایسے ستارے بھی موجود ہیں جن کی روشنی ابھی تک ہم تک نہیں پہنچی اور ایسے ستارے موجود ہیں جن کی روشنی کو ہم تک پہنچنے کے لیے کئی ملین نوری سالوں کی ضرورت ہے۔

علم الافلاک کے ماہرین بیان کرتے ہیں: ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کا سفر طے کرتی ہے۔ اور جب ہم جملہ معلومات کو جمع کرتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جو کچھ ہمیں سادہ آنکھوں یا بھاری بھرکم دوربینوں سے دکھائی دے رہا ہے۔ ان تمام اجرامِ فلکی کا تعلق ''سماءِ دنیا'' سے ہے۔ اب اس کا حجم کیا ہو سکتا ہے، اس کے حساب سے انسان قاصر ہے۔

حدیث پاک میں بیان کیا گیا ہے کہ دوسرے آسمان کے مقابلہ میں پہلے آسمان یعنی آسمانِ دنیا کی وہی حیثیت ہے جو وسیع و عریض صحرا میں ایک انگوٹھی کی ہوتی ہے اور یہی ترتیب ساتویں آسمان تک قائم ہے۔ پھر عرش و کرسی کی حدود کا آغاز ہوتا ہے۔ چاند زمین سے قریب ترین ستارہ ہے۔ اس کے بعد زہرہ و مریخ قریب ترین ستارے ہیں۔ آسمانی کرات کی مسافت کے مقابلہ میں ان کی مسافت کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔

آیت مجیدہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اے گروہ جن و انس! اگر تم زمین اور آسمانوں کے اطراف و حدود سے نکلنے کی قوت رکھتے ہو تو بے شک نکل جاؤ لیکن قوت

کے بغیر تم نہیں نکل سکو گے۔

آج کا انسان اگرچہ زہرہ و مریخ پر کمندیں ڈال چکا ہے لیکن وہ آسمانوں کی حدود سے تو باہر نہیں نکلا جب کہ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اگر انسان کے پاس مخصوص قوت ہو تو وہ آسمانوں کے دائرے سے بھی باہر نکل سکتا ہے۔

بہر نوع موجودہ دور کا انسان انتہائی قریں مسافت ہی طے کر سکا ہے۔ اس کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ زمین و آسمان کے اطراف سے باہر نکل چکا ہے۔

فجور اور تقویٰ کا موازنہ

سوال جناب عالی! سورۂ شمس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (الشمس:۷-۸)

"اور نفس کی قسم! اور جس نے اسے درست کیا ہے پھر اسے اس کے فجور اور اس کے تقویٰ کا الہام کیا ہے"۔

سوال یہ ہے کہ یہاں خدا نے فجور و تقویٰ کا موازنہ کیوں کیا اس کی بجائے اطاعت و معصیت یا صلاح و فساد کے الفاظ کیوں نہیں لائے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے خوب اچھی طرح سے انسانی نفس کو درست کیا ہے۔ اسے ہر لحاظ سے توازن اور اعتدال عطا کیا ہے پھر اسے قدرت و علم کے جوہر سے نوازا ہے۔ بعد ازاں انسانی فطرت کو جتنی بھی چیزوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی، خدا نے وہ تمام چیزیں اسے بہ افراط عطا کی ہیں اور اس کی ہدایت و رہنمائی کا سامان اسے عطا کیا اور اسے عقل و شریعت کی دولت سے نوازا۔ انسان میں حفاظت و پرہیزگاری کی صلاحیت بھی رکھی، اسے تقویٰ سے تعبیر کیا۔

تقویٰ بچاؤ کا سامان رکھنے کو کہا جاتا ہے اور حفاظت کرنے والی چھتری کو

تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لفظ "فجور" کے متعلق راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ فجور دیانت کے پردے کو اوامر و نواہی کی مخالفت کے ذریعہ سے چاک کرنے کا نام ہے۔ اور پڑے ہوئے پردے کو پھاڑنے اور محافظ کے گرا دینے کو لفظ "فجور" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنا جو پیغام انسان کو یاد کرانا چاہتا تھا، اس کے لیے یہ دونوں لفظ انتہائی موزوں ہیں۔ اس آیت مجیدہ سے خدا نے انسان کو یہ پیغام دیا ہے کہ خدا نے اس کی فطرت میں اس تقویٰ اور فجور کا الہام کیا ہے اور اسے غلط کاریوں کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لیے احساس و شعور کی دولت دی گئی ہے اور اسے سوچنے سمجھنے کی قدرت دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ اسے افعال میں آزادی دی گئی ہے اور اسے عقل کی گراں بہا دولت عطا کی گئی ہے۔ جس سے وہ اپنے نفع نقصان کا خود ہی اندازہ لگا سکتا ہے اور اسے خطرات کا احساس ہو سکتا ہے۔ اب اگر چاہے تو انسان آخرت کے خطرات سے بچنے کے لیے شریعت کی چار دیواری میں آ جائے، جہاں اسے دین کی وہ چادر میسر آئے گی جو اسے ہر طرح کے نقصان سے تحفظ فراہم کرے گی۔

حضرت علی علیہ السلام کے قتل کی ناکام سازش

سوال جناب عالی! بیان کیا جاتا ہے کہ وفاتِ رسولؐ کے چند دنوں بعد اہلِ اقتدار نے حضرت علی علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش تیار کی تھی اور اس کے لیے ایک بہادر قاتل کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں لیکن وہ خیل منڈھے نہ چڑھ سکی تھی اور صاحبِ اقتدار نے سلام سے قبل نماز میں کہا: "میں نے تجھے جو کام سپرد کیا تھا اس پر عمل نہ کرنا"۔

سوال یہ ہے کہ یہ روایت کون سی کتابوں میں پائی جاتی ہے؟

جواب یہ روایت حسب ذیل کتابوں میں پائی جاتی ہے:

① سلیم بن قیس الھلالی، جلد۲/۸۷۱-۸۷۳

② احتجاج طبرسی، جلد اوّل/۲۳۱ تا ۲۳۴، ۲۴۰، ۲۴۲، ۲۵۱، ۲۵۲

③ اثبات الہداۃ، جلد۲/۳۶۳

④ تفسیر قمی، جلد۲/۱۵۵-۱۵۸

⑤ علل الشرائع، ص ۱۹۰-۱۹۲

⑥ بحار، جلد۲۹/۱۲۴ تا ۱۲۷، ۱۳۱ تا ۱۳۴

⑦ الخرائج والجرائح، جلد۲/۷۵۷

⑧ ارشاد القلوب، ص ۳۷۸-۳۸۴

حضرت مجلسی لکھتے ہیں: یہ واقعہ سنّی شیعہ میں بڑا مشہور ہے، اگرچہ چند مخالفین نے اس کا انکار بھی کیا ہے۔

جہاں تک اہلِ سنت کتابوں کا سوال ہے تو ابن ابی الحدید معتزلی لکھتے ہیں:

میں نے نقیب ابوجعفر یحییٰ بن ابی زید سے پوچھا: آخر خلفاء نے علیؑ کو قتل کیوں نہ کرایا؟

پھر میں نے ان سے پوچھا: کیا خالد کا واقعہ سچا ہے؟

نقیب یحییٰ نے جواب دیا: جی ہاں، علوی اسے بیان کرتے ہیں۔

ایک شخص امام ابوحنیفہ کے ساتھی زفر بن ہذیل کے پاس آیا اور اس نے ان سے کہا کہ کیا انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ غیر متعلقہ کلام کر کے یا فعل کثیر بجالا کر اپنے آپ کو نماز سے خارج کرے؟

زفر بن ہذیل نے کہا: جی ہاں جائز ہے۔ حضرت ابوبکر نے اپنی تشہد میں جو کہنا تھا کہہ دیا تھا۔

سائل نے کہا: حضرت ابوبکر نے کیا کہا تھا؟

زفر بن ہذیل نے کہا: تیرا اس سے کیا واسطہ ہے؟

سائل نے بار بار اصرار کیا تو زفر نے اہلِ مجلس سے کہا: اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دو، یہ شخص ابوالخطاب کے ساتھیوں میں سے دکھائی دیتا ہے۔

ابن ابی الحدید لکھتے ہیں: میں نے اپنے استاد سے کہا کہ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

نقیب یحییٰ نے جواب دیا: میں اسے ناممکن سمجھتا ہوں البتہ امامیہ نے اس کی روایت کی ہے۔

بعدازاں میرے استاد نے کہا: میں اسے خالد کی طرف سے ناممکن نہیں سمجھتا کیونکہ وہ بڑا بہادر تھا اور اسے حضرت علیؑ سے شدید دشمنی تھی لیکن خلیفہ کی طرف سے میں اس بات کو ناممکن سمجھتا ہوں کیونکہ خلیفہ خوفِ خدا رکھنے والے تھے۔ اس سے قبل وہ خلافت اور فدک پر قابض ہو چکے تھے اور رسولؐ خدا کی صاحبزادی کو ناراض کر چکے تھے۔ لہٰذا ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ علیؑ کو قتل کراتے۔

میں نے کہا: کیا خالد حضرت علیؑ کو قتل کر سکتا تھا؟

میرے استاد نے کہا: جی ہاں، اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ تلوار اس کے پاس موجود تھی جب کہ علیؑ خالی ہاتھ تھے۔ وہ حملہ پر آمادہ تھا اور علیؑ غافل تھے۔ آخر ابن ملجم نے بھی تو علیؑ کو قتل کر دیا تھا جب کہ خالد اس سے کہیں دلیر تھے۔

میں نے استاد سے عرض کیا: امامیہ اس واقعہ کو کون سے الفاظ سے بیان کرتے ہیں؟

یہ سن کر میرے استاد ہنسنے لگے اور فرمایا: بہت سے لوگوں کو علم ہوتا ہے پھر بھی وہ پوچھتے رہتے ہیں۔ بعدازاں انھوں نے مجھ سے فرمایا: اس بات کو جانے دو۔ (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد ۱۳/ ۳۰۱-۳۰۲)

ابن ابی الحدید کے اس اعتراف سے آپ اچھی طرح سے یہ بات جان سکتے ہیں کہ یہ روایت اہل سنت کے ہاں بھی موجود ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اور خلیفہ ثانی کا مرثیہ

سوال جناب عالی! نہج البلاغہ طبع موسسۃ الاعلمی، بیروت، لبنان میں خطبہ ۲۲۵ کی سرخی یہ ہے:

ومن کلام له فی الثناء علی عمر بن الخطاب

''حضرت عمر بن الخطاب کی تعریف میں آپ کا کلام''۔

مذکورہ خطبہ کے الفاظ یہ ہیں:

لله بلاء فلان فقد قوم الاود وداوی العمد خلف الفتنة واقام السنة ذهب نقی الثوب قلیل العیب اصاب خیرها وسبق شرها ادی الی الله طاعته واتقاه بحقه رحل وترکهم فی طرق متشعبة لا یهتدی فیها الضال ولا یستیقن المهتدی

''فلاں شخص کی کارکردگیوں کی جزا اللہ دے، انھوں نے ٹیڑھے پن کو سیدھا کیا، مرض کا چارہ کیا، فتنہ وفساد کو پیچھے چھوڑ گئے، سنت کو قائم کیا۔ صاف ستھرے دامن اور کم عیبوں کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔ (دنیا کی) بھلائیوں کو پا لیا اور اس کی شر انگیزیوں سے آگے بڑھ گئے۔ اللہ کی اطاعت بھی کی اور اس کا پورا پورا خوف بھی کھایا۔ خود چلے گئے اور لوگوں کو ایسے متفرق راستوں میں چھوڑ گئے جن میں گم کردہ راستہ نہیں پا سکتا اور ہدایت یافتہ یقین تک نہیں پہنچ سکتا''۔

اس خطبہ کی تاویل کس طرح سے کی جائے گی؟

جواب وضاحت: آیت اللہ جعفر العاملی نے اس کا مختصر جواب دیا ہے اور اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ہم مفتی جعفر حسین مرحوم کا وہ طویل تجزیہ نقل کرنا چاہتے ہیں جو کہ انھوں نے اس خطبہ کے ضمن میں لکھا۔ چنانچہ مفتی جعفر حسین مرحوم رقم طراز ہیں:

ابن ابی الحدید نے تحریر کیا ہے کہ لفظ فلاں کنایہ ہے۔ حضرت عمر سے اور یہ کلمات انھی کی مدح وتوصیف میں کہے گئے ہیں اور اس کے متعلق ابن ابی الحدید نے دعوئی کیا ہے کہ سید فخار بن معد الموسوی الاودی شاعر نے اس سے بیان کیا تھا کہ سید رضی کے قلمی نسخہ میں لفظ "فلان" کی جگہ "عمر" لکھا ہوا ہے۔

ہم اس دعوئی کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اگر اس بات کو درست بھی مان لیا جائے تو عین ممکن ہے کہ اس نسخہ کے مالک نے لفظ "فلاں" کے بجائے خلیفۂ ثانی کا نام اپنی عقیدت کے تحت لکھ دیا ہو۔

اور اگر سید رضی نے بطور تشریح خلیفہ کا نام لکھا ہوتا تو جس طرح سے ان کے دوسرے تشریحات موجود ہیں۔ اس تشریح کو بھی موجود ہونا چاہیے تھا اور ان نسخوں میں بھی اس کا وجود ہونا چاہیے تھا جو اُن کے نسخہ سے نقل ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ اب بھی موصل میں مستعصم باللہ کے دور کے شہرۂ آفاق خطاط یاقوت المستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قدیم ترین نہج البلاغہ کا نسخہ موجود ہے۔ مگر سید رضی کی اس تشریح کی نشان دہی کسی نے بھی نہیں کی۔

حیرت ہے کہ ابن ابی الحدید ساتویں ہجری میں سید رضی کے اڑھائی سو برس بعد یہ افادہ فرماتے ہیں کہ اس سے حضرت عمر مراد ہیں اور یہ کہ خود سید رضی نے اس کی تصریح کر دی تھی۔

چنانچہ ان کے تتبع میں بعض دوسرے شارحین نے بھی یہی لکھنا شروع کر دیا

لیکن رضی کے معاصرین میں سے جن لوگوں نے بھی نہج البلاغہ کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ ان کی تحریرات میں اس کا کچھ پتا نہیں چلتا حالانکہ بحیثیت معاصر ہونے کے سید رضی کی تحریر پر انھیں زیادہ مطلع ہونا چاہیے تھے۔ چنانچہ علامہ علی ابن الناصر جو جناب سید رضی کے ہم عصر تھے اور انھی کے دور میں نہج البلاغہ کی شرح اعلام نہج البلاغہ کے نام سے لکھتے ہیں: وہ اس خطبہ کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

مدح بعض اصحاب بحسن السیرۃ وانهٗ مات قبل الفتنة التي وقعت بعد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وآله

''حضرتؑ نے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص کو حسنِ سیرت کے ساتھ سراہا ہے کہ جو پیغمبرؐ کے بعد پیدا ہونے والے فتنہ سے پہلے انتقال کر چکا تھا''۔

اس کی تائید علامہ قطب الدین راوندی (متوفی ۵۷۳ھ) کی شرح نہج البلاغہ سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ابن میثم نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

انما اراد بعض اصحابه في زمن رسول اللّٰه ممن مات قبل وقوع فتنة وانتشارها

''حضرتؑ نے اس سے زمانہ پیغمبرؐ کے اپنے ایک ایسے ساتھی کو مراد لیا ہے جو فتنہ کے برپا ہونے اور پھیلنے سے پہلے ہی رحلت کر چکا تھا''۔

اگر یہ کلمات حضرت عمر کے متعلق ہوتے اور ان کے متعلق کوئی قابلِ اعتماد سند ہوتی تو ابن ابی الحدید اس سند و روایت کو درج کرتے اور اس کا ذکر تاریخ میں آتا اور زبانوں پر اس کا چرچا ہوتا، مگر یہاں تو اثبات مدعا کے لیے خود ساختہ قرائن کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ چنانچہ وہ ''خیرھا'' اور ''شرھا'' کی ضمیر مرجع خلافت کو قرار دیتے

ہوئے لکھتے ہیں: یہ کلمات ایسے ہی شخص پر صادق آسکتے ہیں جو تسلط و اقتدار رکھتا ہو، کیونکہ اقتدار کے بغیر ناممکن ہے کہ سنت کی ترویج اور بدعت کی روک تھام کی جا سکے۔
یہ ہے اس دلیل کا خلاصہ جسے اس مقام پر پیش کیا ہے، حالانکہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ ضمیر مرجع خلافت ہے بلکہ وہ ضمیر دنیا کی طرف راجع ہو سکتی ہے جو سیاق کلام سے مستفاد ہے اور مفاد عامہ کی حفاظت اور ترویج سنت کے لیے اقتدار کی شرط لگا دینا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دروازہ بند کر دیتا ہے حالانکہ خداوند عالم نے شرط اقتدار کے بغیر اُمت کے ایک گروہ پر یہ فریضہ عائد کیا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

"تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کاموں کا حکم دے اور بُرے کاموں سے روکے"۔

اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

لا یزال الناس بخیر ما امروا بالمعروف ونهوا عن المنکر وتعاونوا علی البر والتقویٰ

"لوگ جب تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہیں گے اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے رہیں گے وہ بھلائی پر باقی رہیں گے"۔

اسی طرح امیر المومنین اپنی ایک وصیت میں عمومیت کے ساتھ فرماتے ہیں:

اقیموا ھذین العمودین واوقدوا ھذین المصباحین

"توحید اور سنت کے ستونوں کو قائم کرو اور ان دونوں چراغوں کو روشن رکھو"۔

ان ارشادات میں یہ کہیں بھی واضح نہیں کہ اس فریضہ کی انجام دہی حکومت و اقتدار کے بغیر نہیں ہوسکتی اور واقعات یہ بھی بتاتے ہیں کہ امراء و سلاطین لشکر و سپاہ اور قوت کے باوجود برائیوں کو اس حد تک نہ مٹا سکے اور نیکیوں کو اس قدر فروغ نہ دے سکے جس قدر بعض گم نام اور شکستہ حال درویش دل و دماغ پر اپنی روحانیت کا نقش بٹھا کر اخلاقی رخصتوں کو اُبھار گئے حالانکہ نہ ان کی پشت پر کوئی فوج کوئی سپاہ ہوتی تھی اور نہ بے سروسامانی کے علاوہ کوئی سامان ہوتا تھا۔ بے شک تسلط و اقتدار سروں کو جھکا سکتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ دلوں میں نیکی کی راہ بھی پیدا کر سکے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بیش تر اسلامی تاج داروں نے اسلامی خدوخال کو مٹا کر رکھ دیا۔ اور اسلام اپنے بقا و فروغ کے لیے صرف ان بے نواؤں کا مرہونِ منت رہا جن کی جھولی میں فقر و نامرادی کے علاوہ کچھ نہ ہوتا تھا۔

اگر اسی پر اصرار ہو کہ اس سے صرف ایک حکمران ہی مراد لیا جاسکتا ہے تو کیوں نہ اس سے حضرت کا کوئی ایسا ساتھی مراد لیا جائے جو کسی صوبہ پر حکمران رہ چکا ہو۔ جیسے حضرت سلمان فارسی جن کی تجہیز و تکفین کے لیے حضرت مدائن تشریف لے گئے تھے اور بعید نہیں کہ ان کے دفن کرنے کے بعد ان کی زندگی اور آئین حکمرانی پر تبصرہ فرماتے ہوئے حضرت نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہوں۔ پھر یہ سمجھنا کہ وہ حضرت عمر ہی کے متعلق الفاظ ہیں، بلادلیل ہی تو ہے۔

آخر میں اثبات مدعا کے لیے طبری اس روایت کو پیش کرتا ہے:

عن المغیرة ابن شعبه قال لما مات عمر رضی الله عنه بکته ابنة ابی حثمة فقالت واعمراه اقام الاولاد وابرأ العمد امات انقن واحیی اسنن خرج نقی الثوب بریئًا من العیب (قال) وقال المغیرة ابن الشبه لماد

فن عمر اتیت علیا وانا احب ان اسمع منه فی عمر شیئًا فخرج ینفض راسه وهو ملتف بثوب لا یشك ان الامر یصیر الیه فقال یرحم الله ابن الخطاب لقد صدقت ابنه ابی حشمه لقد ذهب بخیرها ونجا من شرها اما والله ما قالت ولکن قولت (طبری، ج۳، ص۲۸۵)

"مغیرہ ابن شعبہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر کی وفات پر بنت ابی حشمہ نے روتے ہوئے کہا کہ ہائے عمر تو وہ تھا جس نے ٹیڑھے پن کو سیدھا کیا اور بیماریوں کو دُور کیا، فتنوں کو مٹایا اور سنتوں کو زندہ کیا۔ پاکیزہ دامن اور عیبوں سے بچ کر چل بسا۔ (مؤرخ طبری کہتے ہیں کہ) مغیرہ نے بیان کیا کہ جب حضرت عمر دفن ہوگئے تو میں حضرت علیؑ کے پاس آیا اور میں چاہتا تھا کہ آپ سے حضرت عمر کے بارے میں کچھ سنوں۔ چنانچہ میرے جانے پر حضرت باہر تشریف لائے اس حالت میں کہ آپ نے غسل فرما کر ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے تھے اور سر اور داڑھی کے بالوں کو جھٹک رہے تھے اور آپ کو اس میں شبہ نہ تھا کہ خلافت آپ ہی کی طرف پلٹے گی۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا: خدا ابن خطاب پر رحم کرے۔ بنت ابی حشمہ نے سچ کہا ہے کہ وہ خلافت کے فائدے اُٹھا گئے اور بعد میں پیدا ہونے والے فتنوں سے بچ نکلے، خدا کی قسم بنت ابی حشمہ نے نہیں کہا بلکہ اس سے کہلوایا گیا ہے"۔

اس واقعہ کا راوی مغیرہ ابن شبہ ہے جس کا اُم جمیل کے ساتھ فعلِ بد کا مرتکب

ہونا اور شہادت کے باوجود حضرت عمر کا اسے حد سے بچالینا اور معاویہ کے حکم سے اس کا علانیہ کوفہ میں امیر المومنین پر سب وشتم کرنا تاریخی مسلمات میں سے ہے۔ اس بنا پر اس روایت کا جو وزن ہوسکتا ہے وہ ظاہر ہے اور پھر روایتاً بھی اس روایت کو قبول نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مغیرہ کا کہنا ہے کہ امیر المومنینؑ کو اپنی خلافت میں کوئی شبہ نہ تھا، حقیقت کے خلاف ہے۔ آخر وہ کون سے قرائن تھے جن سے اس نے یہ اندازہ لگایا جبکہ تاریخی حقائق سے اس کے سراسر خلاف ہیں اور اگر کسی کی خلافت یقینی تھی تو وہ حضرت عثمان تھے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن ابن عوف نے شوریٰ کے موقع پر امیر المومنینؑ سے کہا:

یاعلی لا تعجل نفسک سبیلاً فانی قد نظرت وشاورت الناس فاذاھم لا یعدلون بعثمان (طبری، ج۳، ص ۲۹۷)

”اے علیؑ! تم اپنے لیے ضرر کی صورت پیدا نہ کرو، میں نے دیکھ بھال لیا ہے اور لوگوں سے مشورہ بھی کر لیا ہے وہ سب عثمان کو چاہتے ہیں“۔

چنانچہ حضرت کو خلافت کے نہ ملنے کا پورا یقین تھا جیسا کہ خطبہ شقشقیہ کے ذیل میں تاریخ طبری سے نقل کیا جاچکا ہے کہ امیر المومنین نے ارکان شوریٰ کے نام دیکھتے ہی عباس ابن عبدالمطلب سے فرمادیا تھا کہ خلافت عثمان کے علاوہ کسی اور کو نہیں مل سکتی۔ کیونکہ تمام اختیارات عبدالرحمٰن کو سونپ دیئے گئے ہیں اور وہ عثمان کے بہنوئی ہیں اور سعد ابن ابی وقاص عبدالرحمٰن کے عزیز وہم قبیلہ ہیں اور یہ دونوں مل کر خلافت انھی کو دیں گے۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا جذبہ ہے جس نے مغیرہ کے دل میں یہ تڑپ پیدا کی کہ وہ حضرت عمر کے متعلق امیر المومنین سے کچھ کہلوائے، اگر وہ یہ جانتا تھا کہ حضرت ان کے متعلق اچھے خیالات رکھتے ہیں تو ان کے تاثرات کا بھی

اندازہ ہوسکتا تھا اور اگر یہ سمجھتا تھا کہ امیر المومنین ان کے متعلق حسنِ ظن نہیں رکھتے تو پوچھنے کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ آپ جو کچھ فرمائیں اسے اُچھال کر فضا کو ان کے خلاف اور ارکانِ شوریٰ کو ان سے بدظن کیا جائے اور ارکانِ شوریٰ کے نظریات تو اسی سے ظاہر ہیں کہ وہ خلافت میں سیرت شیخین کی پابندی لگا کر شیخین سے اپنی عقیدت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان حالات میں جب مغیرہ نے یہ سازش کرنا چاہی تو آپ نے حکایت واقعہ کے طور پر فرمایا:

لقد ذهب بخيرها وتجا من شرها

اس جملہ مدح کو توصیف سے کوئی لگائی لگاؤ نہیں، یقیناً وہ رہے دور میں ہر طرح کے فائدے اُٹھاتے رہے اور بعد میں پیدا ہونے والے فتنوں سے ان کا دور خالی رہا۔

ابن ابی الحدید اس روایت کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وهذا كما ترى يقوى الظن ان المراد والمعنى بالكلام هو عمر ابن خطاب

"اس روایت سے یہ ظن قوی ہوجاتا ہے کہ اس کلام سے مراد و مقصود عمر ابن الخطاب ہیں"۔

اگر اس کلام سے وہ کلمات مراد ہیں جو بنت ابی حثمہ نے کہے کہ جن کے متعلق امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ یہ اس کے دل کی آواز نہیں بلکہ اس سے کہلوائے گئے ہیں۔ ہیں تو بے شک اس سے حضرت عمر مراد ہیں لیکن یہ الفاظ امیر المومنین نے حضرت عمر کی مدح میں کہے ہیں، یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس روایت سے تو صراحتاً یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ الفاظ بنت ابی حثمہ نے کہے تھے۔ خدا جانے کس بنا پر بنت ابی حثمہ کے الفاظ کو درج کرکے یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ یہ الفاظ امیر المومنینؑ نے

حضرت عمر کے بارے میں کہے ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنینؑ نے کسی موقع پر کسی کے متعلق یہ الفاظ کسی کے متعلق کہے ہوں گے اور بنت ابی حثمہ نے حضرت عمر کے انتقال پر ان سے ملتے جلتے الفاظ کہے تو حضرت علیؑ کے کلمات کو بھی حضرت عمر کی مدح میں سمجھ لیا گیا ورنہ عقل اعتزال کے علاوہ کوئی عقل یہ تجویز نہیں کر سکتی کہ بنت ابی حثمہ کے کہے ہوئے الفاظ کو اس کی دلیل قرار دیا جائے کہ امیر المومنینؑ نے حضرت عمر کی مدح میں الفاظ فرمائے ہیں۔

کیا خطبہ شقشقیہ کے تصریحات کے بعد یہ توقع ہو سکتی ہے کہ امیر المومنینؑ نے ایسے الفاظ کہے ہوں گے اور پھر غور طلب بات ہے کہ حضرت عمر کی وفات پر تو آپ نے یہ الفاظ فرمائے اور جب آپ شوریٰ کے موقع پر علانیہ شیخین کی سیرت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو آپ سے یہ نہیں کہا جاتا کہ کل تو آپ یہ فرما رہے ہیں کہ انھوں نے سنتوں کو قائم کیا اور بدعت کو مٹایا تو جب ان کی سیرت سنت سے ہم نوا ہے تو پھر سنت کو تسلیم کرنے کے بعد سیرت سے انکار کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ (انتہیٰ قولہ اضافۃ من المترجم)

خانہ زہراؑ حملے کی زد میں

المیزان الثقافیہ ٹی وی پر ایک بار مباحثہ پیش کیا گیا جس کا عنوان تھا: ''اوّل و ثانی کی طرف سے خانہ زہرا پر یورش''۔

اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے ''بدری'' نامی ایک سُنّی نے انتہائی غیر محتاط اور غیر عالمانہ رویہ اپنایا۔ اس کے سامنے ابن تیمیہ کا یہ اعتراض بیان پیش کیا گیا کہ ہم ان الفاظ کا اعتراف کرتے ہیں۔ انہ [کبس] البیت ینظر هل فیه شئ من مال اللّٰہ الذی یقسمه، (منہاج السنہ، جلد۴/۲۲۰، طبع دار الکتب العلمیہ)

یہ سچ ہے کہ حضرت ابو بکر نے حضرت علیؑ و بتولؑ کے گھر کی تلاشی لی تھی۔

دراصل وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیا اس گھر میں کوئی قابل تقسیم حکومتی مال موجود ہے یا نہیں ہے۔

اس اقتباس کو پیش کر کے علی بحرالعلوم نے یہ کہا کہ ابن تیمیہ نے خانہ بتولؑ پر یورش کا اعتراف کیا ہے۔

اس کے جواب میں شریک مذاکرہ "بدری" نے یہ کہا: اس رافضی نے ابن تیمیہ کی کتاب کے پورے الفاظ بیان نہیں کیے۔ لیجیے میں ان کی پوری عبارت پڑھے دیتا ہوں۔

حضرت ابوبکر پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی موت کے وقت یہ کہا تھا۔ کاش میں نے زہراؑ کے گھر کو چھوڑ دیا ہوتا اور اس کی تلاشی نہ لی ہوتی اور اے کاش! میں نے بنی ساعدہ کے چھپر میں بیٹھ کر ایک شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہوتی (اور خود خلیفہ نہ بنا ہوتا) چنانچہ وہ امیر ہوتا اور میں وزیر ہوتا۔

اس پر مذاکرہ میں شریک شیعہ نے کہا کہ حضرت ابوبکر نے خود اقرار کیا تھا کہ انھوں نے حضرت علیؑ اور زبیر کے اجتماع کی وجہ سے حضرت زہراؑ کے گھر پر حملہ کیا تھا۔

اس کے جواب میں "بدری" نے کہا کہ ہم اس روایت کو تب مانیں گے جب یہ اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہوگی۔ چونکہ اسناد اور رجال کا حال معلوم نہیں ہے اسی لیے ہم یہ ماننے پر آمادہ نہیں ہیں کہ خلیفہ نے حضرت علیؑ و زبیر کو اذیت دینے کی غرض سے خانہ زہراؑ پر حملہ کیا ہو۔ اسی طرح ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ انھوں نے اپنی خلافت سے علیحدہ رہنے والے صحابی سعد بن عبادہ کو کوئی اذیت دی ہو۔

البتہ روایت میں جو "کبس البیت" کا جملہ ہے اس کا بس یہی مقصد ہے کہ حضرت ابوبکر نے علیؑ و بتولؑ کے گھر کی اس نیت سے تلاشی لی تھی کہ کیا کہیں اس میں سرکاری اور حکومتی مال تو موجود نہیں ہے جو فقراء میں تقسیم کرنے سے رہ گیا ہو۔

بعدازاں انھیں اس تلاشی کا بھی حد درجہ افسوس ہوا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ کاش انھوں نے اگر ایسا نہ کیا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ جہاں تک اذیت دینے کا تعلق ہے تو تمام اہلِ علم اور اہلِ دین کا اس پر اجماع ہے کہ انھوں نے کسی کو اذیت نہیں دی تھی۔ اس طرح کی باتیں جاہل اور کذاب کیا کرتے ہیں اور کائنات کے وہ احمق ہی ان کی تائید کرسکتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ صحابہ نے حضرت زہرا کا گھر منہدم کیا تھا اور بی بی کے شکم پر اتنی ضربیں ماری تھیں کہ بی بی کا حمل ساقط ہوگیا تھا۔

یہ سب جھوٹے دعوے ہیں اور اہلِ اسلام کے اتفاق سے یہ بدترین جھوٹ ہے اور اس جھوٹ کی ترویج کوئی حیوان نما انسان ہی کرسکتا ہے۔ اور جہاں تک خلیفہ کے اس قول کا تعلق ہے کہ کاش میں سقیفہ میں امیر نہ بنا ہوتا اور عمر بن الخطاب یا ابوعبیدہ بن الجراح کی بیعت کی ہوتی تو یہ میرے لیے زیادہ بہتر ہوتا۔

اس کے متعلق پہلی بات یہ ہے کہ اس کے اسناد و رجال کا علم نہیں ہے اور اگر بالفرض انھوں نے یہ جملے کہے بھی تھے تو اس سے ان کا زہد اور خوفِ خدا مترشح ہوتا ہے۔

اب میں شیخ الاسلام کے قول کو نقل کرنے کے بعد یہ کہتا ہوں کہ شیعہ ان کے جس کلام سے استدلال کرنا چاہتے ہیں اس میں ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے جس سے وہ استدلال کرسکیں۔

روایت میں کَبَسَ کے الفاظ ہیں: اور کَبَسَ کا یہ حتمی معنی تھوڑا ہے کہ ہجوم بنا کر کسی کے گھر میں داخل ہوا ہو۔ اس کا ایک مفہوم عمومی بھی ہے جس کے معنی صرف داخل ہونے کے ہیں۔

اگر شیعہ اس لفظ سے "یورش" اور حملہ کا مفہوم لینا چاہتے ہیں تو اس مفہوم کا اثبات ان کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ ٹی وی کے اس مذاکرہ کے بعد ہم نے بدری سے رابطہ قائم کیا اور اسے یہ لکھا:

آپ نے بحرالعلوم کی تردید میں ابن تیمیہ کے جس قول کو نقل کیا ہے اس سے آپ حضرات بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن تیمیہ ناصبی تھا اور شوخ چشم تھا اور وہ ہمیشہ اپنے ممدوح افراد کی غلط سلط وکالت کیا کرتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی فرد ......؟؟ اپنے ممدوح فرد کا کوئی نقص تسلیم کرلے تو یہ بات اس امر کا ثبوت ہے کہ اس شخص میں وہ عیب ضرور موجود تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ امیرالمومنین کے خانۂ عصمت پر یورش کی روایت کو صرف شیعہ علماء و مؤرخین نے ہی نقل نہیں کیا۔ شیعوں سے زیادہ اہلِ سنت علماء نے اسے نقل کیا ہے۔ ذیل میں ہم کچھ کتب اہلِ سنت کے حوالے دیتے ہیں:

① المعجم الکبیر طبرانی، جلد اوّل/۶۲

② مجمع الزوائد، جلد۵/۲۰۳

③ سیر اعلام النبلاء (سیر خلفائے راشدین)، ص ۱۷

④ تاریخ اسلام ذہبی، جلد اوّل/۱۱۷-۱۱۸

⑤ العقد الفرید، جلد۴/۲۶۸

⑥ تاریخ یعقوبی، جلد۲/۱۳۷

⑦ الامامۃ والسیاسۃ، جلد اوّل/۱۸

⑧ تاریخ الامم الملوک، طبع المعارف، جلد۳/۴۳۰

⑨ مروج الذہب مسعودی، جلد اوّل/۴۱۴، جلد۲/۳۰۱

⑩ شرح نہج البلاغہ معتزلی، جلد اوّل/۱۳۰، جلد ۱۷/۱۶۴-۱۶۸، جلد۲/۴۶-۴۷، جلد۲۰/۱۷، ۲۴

⑪ کنز العمال، جلد۳/۱۲۵، جلد۵/۶۳۱-۶۳۲

⑫ منتخب کنز العمال (مطبوع مع مسند احمد)، جلد۲/۱۷۱

⑬ تاریخ ابن عساکر در حالات خلیفۂ اوّل

⑭ مختصر تاریخ دمشق، جلد۱۳/۱۲۲

⑮ منال الطالب، ص۲۸۰

⑯ حیاۃ الصحابہ، جلد۲/۲۴

⑰ المغنی، قاضی عبدالجبار، جلد۲۰، قسم اوّل/ ۳۴۰-۳۴۱

کنز العمال میں لکھا ہوا ہے کہ اس واقعہ کو ابوعبیدہ نے کتاب الاموال اور عقیلی نے کتاب الضعفاء اور خیثمہ بن سلیمان طرابلس نے فضائل الصحابہ میں اور ان کے علاوہ طبرانی، ابن عساکر اور سعید بن منصور نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

اس کے بعد صاحب کنز العمال لکھتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے، البتہ اس میں رسولؐ خدا کی کوئی گفتگو شامل نہیں ہے۔ بخاری نے اپنی کتاب میں اعمالِ صحابہ، صحابہ اور فضائلِ صحابہ بھی رسولؐ خدا کی طرف نسبت دیے بغیر لکھے ہیں۔

سعید بن منصور کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ پھر اس کے باوجود ابن تیمیہ یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں کہ اس روایت کی صحت ثابت نہیں ہے۔

② ابن تیمیہ نے یہ لکھا ہے کہ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے حضرت علیؑ و زبیر کو کوئی اذیت نہیں پہنچائی تھی بلکہ انھوں نے تو سعد بن عبادہ کو بھی کوئی اذیت نہیں دی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ یقین صرف ابن تیمیہ تک ہی محدود ہے۔ اس کے علاوہ یہ یقین کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ ابن تیمیہ کا یہ ذاتی نظریہ ہے جس کی کوئی بھی اہمیت نہیں ہے۔ اس کے برعکس بہت سے مؤرخین نے یہ لکھا ہے کہ خلیفہ صاحب نے اپنے مخالفین کو ڈرانے دھمکانے کے تمام حربے استعمال کیے تھے۔ حد یہ ہے کہ خالد

بن ولید کو قتل علیؑ پر مامور کیا گیا تھا لیکن اس سے قبل کہ خالد وہ یہ اقدام کرتا، خلیفہ دل ہی دل میں نادم ہوئے اور انھوں نے نماز میں ہی خالد سے کہا کہ میں نے جو کام تمھارے ذمے لگایا تھا اسے سرانجام نہ دینا۔

چنانچہ ان کے اس فعل کو دیکھ کر ابوحنیفہ نے یہ فتویٰ جاری کیا تھا کہ انسان سلام سے پہلے غیر متعلقہ گفتگو کے ذریعہ سے نماز کی تکمیل کرسکتا ہے۔ اس واقعہ کو سنّی ہونے کے باوجود ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے۔

مسعودی لکھتے ہیں کہ معاویہ نے محمد بن ابی بکر کو ایک خط میں یہ لکھا تھا کہ دونوں بزرگوں نے علیؑ کے متعلق کئی منصوبے بنائے تھے اور اس کو سخت ترین سزا دینے کا ارادہ کیا تھا۔

علاوہ ازیں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت علیؑ کو دھمکی دی تھی کہ اگر انھوں نے بیعت نہ کی تو ان کے گھر کو جلا دیا جائے گا۔ ہم نے اس سلسلہ کی جملہ روایات کو اپنی کتاب ماٗساۃ الزہرا کی دوسری جلد میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔

بلاذری لکھتے ہیں: خلیفہ نے کہا تھا کہ علیؑ کو میرے سامنے ذلیل کر کے پیش کیا جائے۔ (انساب الاشراف، جلد اوّل/۵۸۷)

علامہ معتزلی نے شرح نہج البلاغہ میں کئی ایسے واقعات نقل کیے ہیں۔ ابن قتیبہ دینوری نے "الامامۃ والسیاسۃ" میں بھی حکومتی جبر کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا ان حوالہ جات کی موجودگی میں عدم تشدد کا یقین صرف ابن تیمیہ کو ہی حاصل ہوسکتا ہے باقی انسان اس سے مستثنیٰ ہیں۔

ابن تیمیہ کا یہ کہنا کہ یہ بات صرف اتنی سی تھی کہ خلیفہ نے صرف تلاش کی تھی وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس گھر میں کچھ خدا کا مال تو موجود نہیں ہے جو تقسیم ہونے سے رہ گیا ہو۔ بعدازاں انھیں یہ احساس ہوا تھا کہ اگر وہ یہ اقدام نہ کرتے تو بہتر ہوتا"۔

ابن تیمیہ کی گفتگو کے متعلق ہم یہ کہنا چاہیں گے:

① شاید ابن تیمیہ کے پاس علم غیب تھا جس کی وجہ سے اسے پتہ چل گیا تھا کہ اس یورش کا مقصد اس گھر کی تلاشی تھی!!

کیا اس مزعومہ مقصد کے لیے ابن تیمیہ کے پاس کوئی ثبوت تھا یا نہیں؟ اگر تھا تو انھوں نے اسے پیش کرنے کی زحمت کیوں نہ فرمائی۔

② کیا تلاشی کے لیے صرف حضرت علیؑ و بتولؑ کا گھر ہی رہ گیا تھا، اس طرح کی تلاشیاں اور گھروں میں کیوں نہ کی گئی تھیں۔

③ کیا خلیفہ یہ سمجھتے تھے کہ نعوذ باللہ علی مالِ خداوندی کے خائن ہیں؟!! اور انھوں نے دولت چھپالی ہوگی؟

④ کیا حضرت علیؑ کا گھر مسلمانوں کا بیت المال تھا۔ آخر خلیفہ کو یہ گمان کیوں کرنا پڑا کہ ہو نہ ہو، ان کے گھر میں مال موجود ہے لہٰذا اس کی تلاشی لینا ضروری ہے۔

⑤ آیئے چند لمحات کے لیے لفظ کَبَسَ کے معانی پر توجہ دیں۔ عربی زبان کا مقولہ ہے: کبس القوم دار فلان۔ اس کا معنی یہ ہے کہ لوگوں نے فلاں گھر پر اچانک دھاوا بول دیا اور انھیں گھر کی حفاظت کے لائق نہیں چھوڑا۔

⑥ حضرت زہراؑ کے گھر پر دھاوا بولنے کو بعض مؤرخین نے کشف بیت فاطمة کے الفاظ سے پیش کیا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ اس نے خانہ زہراؑ کو حملہ آوروں کے لیے کھول دیا۔

ذرا انصاف کرتے ہوئے بتائیں کہ جب گھر پر دھاوا بولا گیا ہوگا تو کیا گھر والے اس پر خوش ہوئے ہوں گے؟ اور جب حملہ آور گھر میں داخل ہوئے ہوں گے تو کیا اس پر گھر والوں نے جشن منایا ہوگا؟

کیا یورش کرنے والے بلوائی اجازت لے کر گھر میں داخل ہوئے تھے؟ اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ گھر والوں نے اجازت دی تھی تو اس کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟

اور جب گھر والوں کی رضا اس میں شامل نہ تھی اور یقیناً نہیں تھی تو گھر پر دھاوا بولنا ریاستی طاقت کے ظلم وتشدد کا عملی ثبوت نہ تھا؟

خدارا بتایئے بلوہ عام کر کے جو لوگ بنتِ رسولؐ کے گھر میں گئے ہوں گے ان پر رسولؐ خدا کی بیٹی خوش ہوئی ہوں گی یا ناراض؟

بخاری لکھتے ہیں: حضرت فاطمہؑ کی رضا پر خدا راضی ہوتا ہے اور جس پر حضرت فاطمہؑ غضب ناک ہوں اس پر خدا غضب ناک ہوتا ہے۔

بخاری نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت زہراؑ خلیفہ پر ناراض ہوئی تھیں اور ناراضگی کے عالم ہی میں دنیا سے رخصت ہوئی تھیں۔

۴ ابن تیمیہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اہلِ اقتدار نے کسی کو کبھی اذیت نہیں دی تھی۔ اس پر اہلِ علم واہلِ دین کا اجماع ہے۔ اذیت کی باتیں صرف کاذب جہال نقل کرتے ہیں اور ان کی تائید صرف وہ احمق غالی کرتے ہیں جو صحابہ پر یہ تہمت عائد کرتے ہیں کہ انھوں نے بی بی فاطمہؑ کے گھر کو منہدم کیا تھا اور بی بی پر اتنا تشدد کیا تھا کہ ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔

ابن تیمیہ کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں: اہلِ سنت میں سے بہت سے علماء نے ان واقعات کو نقل کیا ہے اور ان میں طبرانی، بلاذری، معتزلی، متقی ہندی، سعید بن منصور، ابن عساکر، ذہبی، یعقوبی، ابن عبدربہ، ابن قتیبہ اور طبری جیسے آسمان قامت علماء شامل ہیں۔

۱ ہم ابن تیمیہ اور اس کے پیروکاروں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آیا مذکورہ

بالا افراد جاہل وکذاب تھے؟!

۲ مذکورہ بالا علماء کے بیانات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابن تیمیہ کا یہ کہنا باطل ہے کہ اُمت کا اس امر پر اجماع ہے کہ سقیفائی خلافت کے حکمرانوں نے کسی پر کوئی تشدد نہیں کیا تھا۔

۳ ابن تیمیہ نے جھوٹ کہا ہے کہ کچھ لوگ صحابہ کی مخالفت میں کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت زہراؑ کے مکان کو منہدم کر دیا تھا۔ آج تک کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔

۴ جہاں تک حضرت زہراؑ پر تشدد کا تعلق ہے جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا تو اس کا ذکر خود علمائے اہلِ سنت نے کیا ہے۔ اس کے لیے شہرستانی کی کتاب الملل والنحل میں "نظام" کے نظریہ کا مطالعہ کریں۔

ہم نے اپنی کتاب مأساۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی دوسری جلد میں پوری تفصیل سے ایسی کتب اہلِ سنت کے حوالے دیئے ہیں جن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اہلِ خلافت نے حضرت سیدہ پر تشدد کیا تھا جس کی وجہ سے بی بی کا حمل گر گیا تھا اور اگر ان مصادر ومنابع کے خواہش مند ہوں تو ہم ان کی بھی نشان دہی کرنے پر آمادہ ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر اتنے سارے علماء اہلِ سنت ابن تیمیہ کے بقول کائنات کے احمق ہیں تو پھر مذہب خلافت میں دانش مند افراد کتنے بچتے ہیں؟!

مذکورہ بالا تمام علماء کا تعلق آپ کے مذہب سے تھا۔ یہ شیعہ نہیں تھے۔

۵ ابن تیمیہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس طرح کی تمام باتیں سفید جھوٹ ہیں۔ اس پر اہلِ اسلام کا اجماع ہے۔ ان باتوں کو کوئی جانور صفت انسان ہی قبول کر سکتا ہے۔

ابن تیمیہ کی روح کو ہم مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ جسے آپ سفید جھوٹ کہہ رہے ہیں اسے آپ کے مذہب کے علماء نے لکھا ہے اور جب اتنے علماء نے ان

واقعات کو نقل کیا ہے تو آپ کا مزعومہ اہلِ اسلام کا اجماع کہاں گیا ہے؟ اور اگر کچھ سُنّی علماء نے ان واقعات کو نقل نہیں کیا تو کم از کم انھوں نے ان کی تردید میں بھی کچھ نہیں لکھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابن تیمیہ اپنے ذاتی وضع کردہ نظریہ کو عالمِ اسلام کے اجماع سے تعبیر کرتا تھا۔

۹ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر کے متعلق جو یہ بات مشہور ہے کہ انھوں نے کہا تھا کہ کاش میں نے خلافت کا بوجھ نہ اٹھایا ہوتا اور عمر بن الخطاب یا ابوعبیدہ کی بیعت کر لی ہوتی تو میرے حق میں بہتر تھا۔

یہ روایت ناقابلِ قبول ہے کیونکہ یہ بلا اسناد ہے اور اس کی صحت واضح نہیں ہے۔ جی ہاں، اگر حضرت ابوبکر نے یہ جملے کہے بھی ہوں تو انھوں نے اپنے زُہد اور تواضع کی وجہ سے کہے ہوں گے۔

۱ ابن تیمیہ نے یہاں بھی ڈنڈی ماری ہے۔ اسناد کے نہ ہونے کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ واقعہ غلط ہے۔ ویسے ابن تیمیہ کو خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ اس گفتگو کے اسناد بھی ہیں اور ہم نے ان اسناد کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

۲ بہت سے ثابت شدہ تاریخی حقائق ایسے ہیں جن کی اسناد نہیں ہیں۔ بہت سے واقعات کو مؤرخین نے تاریخی واقعات سمجھ کر نقل کیا ہے اور اس کے لیے انھوں نے اسناد کا تکلف نہیں کیا۔

۳ ابن تیمیہ کا یہ کہنا بھی بالکل لغو ہے کہ اگر انھوں نے یہ جملے کہے تھے تو انھوں نے زُہد و تقویٰ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کہے تھے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ابن تیمیہ کو اس تاویل کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اس کی بجائے یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ ان جملوں سے ان کی ندامت اور پشیمانی ٹپکتی ہے اور انھیں اس امر پر ندامت تھی کہ وہ

اس منصب کے حق دار نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے خلافت کا پیراہن پہن لیا تھا۔

سابقہ بحث کے نتائج حسب ذیل ہیں:

① ابن تیمیہ نے حضرت ابوبکر کی جو صفائی دی ہے کہ انھوں نے یہ جملے نہیں کہے تھے وہ اسے ثابت کرنے میں بُری طرح سے ناکام رہے ہیں۔

② لفظ کَبَسَ روایات میں عمومی معنی میں نہیں ہے۔ یہ دھاوا بولنے کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔

جب ہم نے بدری کو اپنا یہ مکتوب روانہ کیا تو اس کے جواب میں بدری نے ہمیں یہ خط لکھا:

بدری کا جواب عاملی کے نام

آپ کو اس بحث سے کیا حاصل ہوا؟ آپ کا جواب تکرار پر مشتمل ہے، آپ نے یہ لکھا:

③ امیرالمومنینؑ کے گھر پر یورش کے واقعہ کو صرف شیعوں نے ہی نہیں لکھا اسے سُنّی علماء نے بھی لکھا ہے۔ پھر اس کے بعد آپ نے لکھا ہے:

ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں کہ بہت سے اہلِ سنت علماء نے یہ باتیں نقل کی ہیں۔ پھر اس کے بعد آپ نے لکھا:

④ جہاں تک حضرت زہراؑ پر تشدد کا تعلق ہے جس سے ان کا حمل ساقط ہوا تو اسے کچھ اہلِ سنت علماء نے بھی لکھا ہے اور ہم نے اپنی کتاب ماساۃ الزھرا کی جلد دوم میں اس کے مصادر و مآخذ کی تفصیلی بحث کی ہے۔

پھر آپ نے لکھا: یہ واقعہ لکھنے والے عام سُنّی نہیں بلکہ ان کے بزرگ علماء ہیں۔

میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ ہیر پھیر کر ایک ہی بات دُہرائے جا رہے ہیں۔ آپ اتنا بھی لکھ سکتے تھے کہ اہلِ سنت علماء نے یہ لکھا ہے۔ آخر آپ کو اتنے لمبے چوڑے تکرار کی بھلا کیا ضرورت تھی؟

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے الفاظ کی تکرار کو دیکھ کر آپ کا مخالف مرعوب ہو جائے گا؟ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں چاہوں تو ہم اس واقعہ کے مصادر و منابع پیش کرنے پر بھی آمادہ ہیں۔

اس کے متعلق میرا جواب یہ ہے کہ آپ مصادر و منابع ضرور پیش کریں لیکن اسناد کے ساتھ پیش کریں ورنہ میں صرف مصادر کے نام پڑھ کر اسے کافی نہیں سمجھوں گا۔

اگر صرف مصادر کا حوالہ ہی کافی ہے تو کیا خیال ہے کہ اگر میں تحریف قرآن کے اثبات کے لیے آپ کے مصادر و منابع لکھ کر آپ کے پاس بھیج دوں اور اسناد تحریر نہ کروں تو کیا آپ مصادر و منابع کی طویل فہرست دیکھ کر نظریہ تحریف کو درست قرار دیں گے؟!!

آپ نے یہ لکھا ہے کہ اسناد کے نہ ہونے سے واقعہ کی نفی نہیں ہو جاتی جب کہ ہم نے جن مصادر کا حوالہ دیا ہے۔ وہاں اسناد بھی موجود ہیں۔ اس کے جواب میں مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کا ''بے رحمانہ'' نظریہ مان لیا جائے تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسناد بالکل ہی غیر ضروری ہیں اور علم جرح و تعدیل کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اس کے اس نظریہ کو ماننے کے بعد ہم یہود و نصاریٰ کی طرح سے بن جائیں گے جو کسی اسناد کے بغیر تورات و انجیل کو مانتے ہیں۔ آپ اور آپ سے پہلے فاطمی نے بھی لفظ کَبَسَ کا یہی معنی کیا تھا کہ اس کا معنی کسی گھر پر دھاوا بولنے کا ہے۔ جب لفظ کَبَسَ کے اور معانی بھی موجود ہیں تو آپ کو صرف اپنے من پسند معنی پر اصرار کیوں ہے؟

آپ اس طرح سے قارئین کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ اس لفظ کا بس ایک ہی معنی ہے اور وہ وہی ہے جسے آپ بیان کر رہے ہیں۔

لفظ کَبَسَ کے اور معانی بھی ہیں جنھیں میں یہاں واضح کرنا چاہتا ہوں۔

لغت کی مشہور کتاب الغریب للخطابی جلد۲/ ۵۲۷ پر مرقوم ہے: کبس رأسه في ثوبه کا معنی یہ ہے کہ ایک شخص نے منہ میں منہ چھپایا۔

لسان العرب، جلد ۶/ ۱۹۰ پر مرقوم ہے: کبس الرجل یکبس کبوسا وتکبس کا معنی ہے کہ اس نے اپنا سر کپڑے میں چھپایا۔ اس کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اس نے کپڑے سے مقنعہ لیا۔ پھر کپڑے کے کچھ ٹکڑے سے سر کو ڈھانپا اور کباس من الرجال اسے کہتے ہیں جو ایسا کرے۔

رجل کباس اسے کہا جاتا ہے کہ جب اس سے تم کچھ سوال کرو تو وہ اپنا سر اپنی قمیص کے دامن سے چھپا لے۔ چنانچہ ایسے شخص کے لیے کہا جاتا ہے: انه مکباس غیر جناس۔

اسی طرح سے لفظ کَبَسَ مطلقاً داخل ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہی معنی ابن تیمیہ نے مراد لیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ فوراً بعد انھوں نے لکھا ہے کہ خلیفہ صاحب نے کسی کو اذیت نہیں پہنچائی تھی۔ اس پر اہلِ علم و دین کا اتفاق ہے جب کہ خلیفہ کے ظلم و زیادتی کی داستانیں جاہل کذاب بیان کرتے ہیں اور اس کی تصدیق وہ احمق غالی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ صحابہ نے حضرت فاطمہؑ کے گھر کو نذرِ آتش کیا تھا اور بی بی پر اتنا جسمانی تشدد کیا تھا کہ ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔

یہ سب سفید جھوٹ اور جھوٹے دعوے ہیں اور اس پر اہلِ اسلام کا اجماع ہے۔ ایسی باتیں صرف وہ لوگ کرتے ہیں جن کا تعلق انسانوں کی بجائے نوعِ حیوانات سے ہوتا ہے۔ جہاں تک آپ کے اس اعتراض کا تعلق ہے کہ حضرت ابوبکر

یہ کہتے تھے کہ کاش سقیفہ میں مَیں نے خلافت قبول نہ کی ہوتی اور دو میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کی ہوتی"۔

سچ یہ ہے کہ ان الفاظ سے خلیفہ کی ندامت نہیں ٹپکتی بلکہ اس سے ان کا زہد اور خوف خدا کا جذبہ جھلکتا ہے۔

بدری کی تردید

ہمیں بدری کا خط موصول ہوا اور ہم نے غور سے اس کا مطالعہ کیا تو ہم نے دیکھا کہ اس کا یہ خط ہمارے موقف کی پوری تردید نہیں کر سکا۔ اس نے بہت سی چیزوں سے صرف نظر کیا ہے اور زیادہ صحیح الفاظ کے مطابق وہ ہمارے موقف کی تردید سے قاصر رہا ہے۔ اس نے ہمارے بہت سے نکات کا جواب ہی نہیں دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے وہ نکات اتنے مستحکم نہیں تھے کہ وہ اس کا جواب دینے کی پوزیشن ہی میں نہیں تھا۔

① اس نے اپنے خط میں اپنے تئیں ہم پر جان دار سوال یہ کیا کہ ہمارے خط میں مطالب کی تکرار پائی جاتی ہے جو کہ اس کے ہاں معیوب ہے۔ بھلا اس بندۂ خدا سے کون پوچھے کہ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کا قصہ بار بار بیان نہیں ہوا؟ اگر ہوا ہے اور اس سے حسنِ قرآن میں کوئی فرق نہیں آیا تو ہمارے بیانِ مطالب سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

② جسے وہ بے چارہ تکرار سمجھ رہا ہے اصل میں وہ تکرار نہیں ہے، وہ اس کے موقف کی جابجا تردید ہے۔

الف: اس نے ابن تیمیہ کا قول پیش کیا کہ اس وقت تک مدح قابلِ قبول نہیں ہے جب تک روایت اسناد صحیح کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے۔ اس طرح سے ابن تیمیہ نے حضرت سیدہؑ کے گھر دھاوا بولے جانے کا انکار کیا تھا اور "کبس اور کشف"

کا انکار کیا تھا۔

اس کے جواب میں ہم نے دھاوا بولے جانے کی روایت کے کچھ مصادر کو بیان کیا اور اس سے ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ امیرالمومنینؑ کے گھر کی بے ادبی کی روایت کو اہلِ سنت علماء نے بھی بیان کیا ہے اور ہم نے حدیث ''کبس اور کشف'' کے اثبات کے لیے مطالب کا تکرار کیا ہے۔

ب: ابن تیمیہ کے اس قول کو بدری نے پیش کیا کہ اہلِ علم و دین کا اس بات پر اجماع ہے کہ خلیفہ نے کسی بھی مخالف کو کوئی اذیت نہیں پہنچائی تھی۔ اس کے جواب میں ہم نے یہ لکھا کہ آپ اجماع کا دعویٰ نہیں کر سکتے کیونکہ بہت سے علماء نے اذیت کی روایات کو نقل کیا ہے۔ لیکن اس نے ہماری اس بات کو تکرار پر محمول کیا۔

ج: بدری نے ابن تیمیہ کا یہ قول نقل کیا کہ اس کی تصدیق صرف وہ احمق غالی ہی کر سکتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ صحابہ نے بی بی فاطمہؑ کے گھر کو منہدم کر دیا تھا اور بی بی پر اتنا تشدد کیا تھا کہ ان کا اسقاطِ حمل ہوگیا۔

اس کے جواب میں ہم نے یہ لکھا کہ آپ احمق غالیوں کو رہنے دیں۔ بعض اہلِ سنت علماء نے اس تشدد کا تذکرہ کیا ہے اور یہ روایت بہت سی کتب اہلِ سنت میں مرقوم ہے لیکن بدری نے اسے بھی ہماری طرف سے تکرار پر محمول کیا۔

د: بدری نے ابن تیمیہ کا یہ قول نقل کیا کہ یہ صرف خودساختہ دعویٰ ہے اور اہلِ اسلام کا اجماع ہے کہ یہ سفید جھوٹ ہے۔

اس کے جواب میں ہم نے لکھا کہ آپ جسے سفید جھوٹ کہہ رہے ہیں اُسے بزرگ علماء اہلِ سنت نے نقل کیا ہے۔ آخر اس کی موجودگی میں آپ اجماع کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں؟

مگر ہمارے اس جواب کو بھی بدری نے تکرار پر محمول کیا۔

بدری کو معلوم ہونا چاہیے کہ تکرار ہماری طرف سے نہیں بلکہ ابن تیمیہ کی طرف سے ہوا ہے۔ اگر اس کی طرف سے تکرار موجود نہ ہوتا تو ہمیں مطالب کے بار بار دہرانے کی بھی حاجت نہ ہوتی۔

۳ بدری نے کہا ہے کہ "عاملی" کو چاہیے کہ وہ منابع اور مصادر کو اسناد رجال کے ساتھ پیش کرے۔ اس کے لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے وعدہ پر قائم ہیں لیکن بدری کو چاہیے کہ اس نے جن نکات کی تردید نہیں کی ہے پہلے ان کے صحیح ہونے کا اعلان کرے۔ اس کے بعد ہم سے منابع اور اسناد کا مطالبہ کرے۔ بصورت دیگر اس سے بحث ہی بے نتیجہ ہے۔ کیونکہ ہماری بحث کا مقصد رضائے الٰہی کی جستجو ہے۔ کسی کی توہین وتحقیر ہمارا مشغلہ نہیں ہے اور اس کے ساتھ ہمیں دل کی گہرائیوں میں جھانک کر یہ فیصلہ بھی کرنا ہوگا کہ ابن تیمیہ جس اجماع اہلِ اسلام کی بات کرتا ہے وہ ابن تیمیہ کا سفید جھوٹ ہے۔

علاوہ ازیں لفظ "کبس اور کشف" کے متعلق جو توجہات ابن تیمیہ نے پیش کی ہیں ان کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہمارے بہت سے نکات پر بدری نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو کیا اسی بدری کی طرف سے "خاموشی نیم رضا" قرار دیا جائے۔

خانۂ زہراؑ کی بے ادبی کی روایات کی سند طلب کرنا ویسے بھی غلط ہے کیونکہ خلفائے ثلاثہ کے مداح علماء نے جب ان کی صداقت کا اقرار کیا ہے تو پھر اس کے بعد اسناد ورجال کا مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے؟

ابن تیمیہ کی زبان درازی قابلِ مذمت ہے۔ اس نے حضرت سیدہؑ کی ناراضگی کا اقرار کرنے والوں کو احمق اور جاہل کہا اور زبان کی انتہا یہ کی یہ لوگ انسان نما حیوان ہیں۔

ابن تیمیہ نے جس انداز سے گستاخی کی ہے تو وہ، یا اس کے پیروکار اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ اہلِ سنت کے امام الحدیث بخاری نے یہ اقرار کیا ہے کہ حضرت زہراؑ مرتے دم تک خلیفہ پر ناراض تھیں اور انھوں نے وصیت کی تھی کہ انھیں رات کی تاریکی میں دفن کیا جائے اور شیخین ان کے جنازہ میں شریک نہ ہوں۔

اب امام بخاری کی ان کے ہاں کیا حیثیت ہے؟ کیا ابن تیمیہ یا اس کا کوئی حواری ہمیں اس کا جواب دے گا؟

۵ بدری نے ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے کہا ہے کہ وہ تحریف قرآن کے متعلق شیعی روایات کی نشان دہی کرے گا۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں:

الف: بدری کا یہ کہنا "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کا مصداق ہے کیونکہ بحث حضرت سیدہؑ کے خانۂ عصمت آشیانہ کی ہو رہی ہے اور اس بے چارے کو قرآن کریم کے متعلق تحریف ثابت کرنے کی لگی ہوئی ہے۔ یہ اس کا مناظرہ سے عملی فرار ہے۔

ب: بدری صاحب! اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو پھر بسم اللہ کریں، دیر کس بات کی ہے لیکن اس بحث کو سوچ سمجھ کر شروع کرنا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس جال میں آپ خود پھنس جائیں اور آپ کو نکلنے کا راستہ ہی بجھائی نہ دے۔

ہم تحریف کے موضوع سے نہ تو خوف زدہ ہیں اور نہ ہی تم سے التماس کرتے ہیں کہ "خدارا اسے رہنے دیں"۔

آپ یہ موضوع شروع کر کے تو دیکھیں پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ تحریف کا قائل کون ہے اور کون نہیں ہے۔

ویسے اگر آپ کو مناظرہ کا اتنا ہی اشتیاق ہے تو پھر جزئی مسائل کی بجائے مرکزی مسئلہ پر ہی بحث کر لیں، اور وہ ہے خدا کی ذات اور صفات کا مسئلہ۔ اس مسئلہ پر مباحثہ سے آپ کی وہابیت کا ریت سے بنا ہوا محل آنِ واحد میں زمین بوس ہو جائے گا۔

د: آپ اسناد کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن آپ کو شاید یہ علم ہی نہیں ہے کہ جب کوئی مسئلہ اور واقعہ سورج کی طرح سے واضح ہو تو پھر اس کے اسناد کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ جب کہ حضرت زہراؑ کی اذیت کی روایات سے کتب اہلِ سنت چھلک رہی ہیں۔

۷: کتب اہلِ سنت میں اسناد صحیحہ کے ساتھ حضرت سیدہؑ کی اذیت کے واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ حد یہ ہے کہ امام بخاری نے اسے اپنی کتاب صحیح بخاری میں لکھا۔

ہمیں آپ کے ردعمل کا پیشگی سے علم ہے۔ آپ ہم پر تکرار کا الزام لگائیں گے لیکن ہمیں آپ کے اس اتہام کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

۶ بدری کے اس قول کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ اگر آپ کے بے رحمانہ قانون کو مان لیا جائے تو پھر اسناد بے فائدہ ہوں گے اور علمِ جرح و تعدیل بے معنی بن کر رہ جائے گا اور ہم یہود و نصاریٰ کی مانند قرار پائیں گے جو کسی بھی اسناد کے بغیر تورات و انجیل کو مانتے ہیں۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں:

۱ آپ نے ہمارے بیان کردہ مفہوم کو "بے رحمانہ قانون" کیوں کہا؟ کیا ایسا کہنے سے ہمارا بیان کردہ مفہوم باطل قرار پائے گا؟

۲ جب قرائن قطعیہ موجود ہوں اور نصوص تواتر کی حد تک موجود ہوں تو پھر اسناد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جب کسی مذہب کا پیروکار ایسی روایت کو نقل کرے جو بظاہر اس کے مذہب کے خلاف ہو اور وہ اس روایت کو تردید بھی نہ کرے تو ایسے موقع پر بھی اسناد کے مطالبہ کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

۳ اگر آپ ہر جگہ اور ہر مسئلہ کے لیے جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کی

پابندی عائد کرنے لگ گئے تو یاد رکھیں آپ کے مذہب کا بڑا حصّہ تحلیل ہو جائے گا اور چند نکمی باتوں کے علاوہ آپ کے مذہب کے دامن میں باقی کچھ بھی دکھائی نہ دے گا۔

۴ گفتگو کا تعلق اس بات سے ہے کہ حضرت زہراؑ کے گھر دھاوا کیوں بولا گیا تھا اور حضرت ابوبکر کو خلیفہ بننے پر ندامت ہوئی تھی اور وہ کہتے تھے کہ کاش میں نے عمر یا ابوعبیدہ میں سے کسی ایک کی بیعت کر لی ہوتی اور خود خلیفہ نہ بنا ہوتا۔

ابن تیمیہ نے اس کے متعلق لکھا کہ یہ روایت بدون سند ہے۔

ہم نے اس کے جواب میں کہا کہ اسناد کا ذکر نہ کیا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ سرے سے یہ بات بے سند ہی ہے۔ اس روایت کی سند موجود ہے اور سعید بن منصور نے اسے ''حسن'' قرار دیا ہے۔

مسند روایت حسب ذیل ہے:

حدثنا ابو الزنباع روح بن الفرج المصری حدثنا سعید بن غفیر حدثنی علوان بن داود البجلی عن حمید بن عبدالرحمن بن عوف عن ابیه قال دخلت علی ابی بکر...... الی آخره

اس پورے سلسلۂ سند میں صرف ''علوان'' پر اعتراض کیا گیا ہے۔ بخاری کہتے ہیں کہ یہ منکر الحدیث تھا۔ بالفاظ دیگر یہ ایسی احادیث بیان کرتا تھا جو ہمارے لیے قابلِ قبول اور قابلِ ہضم نہیں ہوتی تھیں۔

''عقیلی'' نے بھانڈہ چوراہے میں پھوڑا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ علوان پر اور کوئی اعتراض نہیں ہے، البتہ اعتراض ہے تو صرف اس کی اسی روایت پر ہے جس میں اس نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے خلافت پانے کے بعد ندامت محسوس کی تھی اور وہ کہتے تھے کہ کاش میں نے سقیفہ میں ان دو میں سے کسی ایک شخص کی بیعت

کرلی ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا اور حضرت ابوبکر نے کہا تھا کہ کاش میں نے فاطمہ زہراؑ کے گھر کو نہ کھولا ہوتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "علوان" کاذب نہ تھا البتہ اس نے یہ "جرم" ضرور کیا تھا کہ حضرت ابوبکر کی "زود پشیمانوں" کا ذکر کیا تھا ورنہ یہ حدیث ہر لحاظ سے صحیح ہے۔

اس پر اعتراض کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس سے جبینوں پر سلوٹیں طاری ہوتی ہیں۔

کسی روایت کو رد کرنے کا یہ طریقہ انتہائی گھٹیا اور ناروا ہے۔ چنانچہ ذہبی اور اس کے ہم نواؤں کا یہی طریق کار تھا۔

سعد بن منصور نے اس اسناد کے حسن ہونے کی توثیق کی ہے جو کہ تم پر حجت ہے۔ علاوہ ازیں علمائے اہلِ سنت کا کسی چوں وچرا کیے بغیر اس حدیث کو نقل کرنا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ مان لیا جائے کہ یہ روایت سراسر جھوٹ پر مبنی ہے تو اس جھوٹ کے تراشنے والے بھی سُنّی علماء ہیں شیعہ نہیں ہیں۔

جرح تعدیل کا مطالبہ وہاں کیا جاتا ہے جب روایت ایک ہی طریق سے وارد ہوئی ہو اور جب طرق حدیث زیادہ ہوں تو پھر کس کس طریق پر جرح وتعدیل کے قوانین نافذ کروگے؟

سیدھی سی بات ہے کہ بنت پیغمبر خلیفہ پر ناراض تھیں اور امام بخاری نے بھی بی بی کی ناراضگی کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے: حضرت سیدہ دمِ آخر تک خلیفہ پر ناراض رہی تھیں۔

آپ نے لفظ "کبس" کے جو دوسرے معانی پیش کیے ہیں وہ انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ کبس کا معنی صرف کسی کے گھر پر دھاوا بولنا نہیں ہے اس لفظ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ منہ پر کپڑا ڈال دیا جائے تو کیا اس معنی کے ذریعہ سے آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب خلیفہ کے آدمی بی بی کے گھر میں داخل ہوئے تو انھوں نے

شرمندگی سے منہ ڈھانپے ہوئے تھے؟!! اور اگر بقول آپ کے لفظ کُنّس کا معنی مطلقاً داخل ہونا ہی ہے تو پھر ہمیں بتائیں اس فعل پر خلیفہ کو ندامت کیوں تھی؟!!

⑨ ہماری گفتگو کے بہت سے نکات کی آپ نے کوئی تردید نہیں کی ہے۔ تو کیا ہم اس کا یہ مطلب اخذ کریں کہ آپ کو ان نکات سے اتفاق ہے؟؟

اور کیا آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ابن تیمیہ نے بلاوجہ سُنّی علماء پر سب وشتم کیا ہے؟!!

اور کیا آپ کو اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی ہچکچاہٹ ہے؟؟

☼☼☼

آٹھواں حصّہ

نبوت وانبیاء

سوال جناب عالی! کیا حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت سے قبل ان معارف سے آگاہ تھے جو بعثت کے بعد انھیں نصیب ہوئے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقریر کو قرآنِ حکیم میں ان الفاظ سے نقل کیا:

قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ۟ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ۙ﴿۳۰﴾ وَّ جَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ ۪ وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا ۪ۖ (مریم:۲۹-۳۰)

"عیسیٰؑ نے کہا: میں اللہ کا عبد ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی اور مجھے نبی بنایا اور میں جہاں بھی رہوں مجھے بابرکت بنایا اور جب تک میں زندہ رہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی"۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

وَ اٰتَیۡنٰہُ الۡحُکۡمَ صَبِیًّا ﴿ۙ۱۲﴾ (مریم:۱۲)

"ہم نے اسے بچپنے میں ہی حکم عطا کیا تھا"۔

اب اس کے ساتھ الکافی میں مرقوم یزید الکناسی کی صحیح السند حدیث کو شامل کرلیں کہ اللہ نے جملہ انبیاءؑ کو جو بھی فضیلت اور کرامت عطا کی ہے وہ فضیلت و کرامت ہمارے نبیؐ اکرم کو بھی عطا فرمائی ہے۔

اب مذکورہ الصدر آیات اور اس حدیث کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیدائشی نبی بنایا تھا اور آپ کو بچپن ہی میں حکم عطا کیا تھا۔ (بحار، جلد ۱۸/ ۲۷۸-۲۷۹)

علامہ مجلسی نے اس عنوان پر تفصیلی بحث کی ہے۔ طالبانِ تحقیق کو چاہیے کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ (بحارالانوار، جلد ۱۸/ ۲۷۷-۲۸۱)

ائمہ ہدیٰ سے بہت سی روایات منقول ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ پیدائشی نبی تھے۔ چالیس سال کی عمر میں خدا نے آپ کو تبلیغ دین کا حکم دیا تھا۔ اس حقیقت کی تائید اس مشہور حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے سنّی شیعہ علماء نے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ کا فرمان ہے:

كنت نبيا و آدم بين الماء والطين (الغدیر، جلد ۹/ ۲۸۷)

"میں اس وقت نبی تھا جب آدم مٹی اور پانی میں تھے"۔

جب آپ پیدائشی نبی تھے تو لازمی طور پر آپؐ علوم و نبوت کے بھی مالک تھے۔

روایات بیان کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی پیدائش سے آپ کو ایک ہزار زمانہ پہلے پیدا کیا تھا۔ پھر اللہ نے آپ کو ہر چیز کا گواہ مقرر کیا تھا۔

حضرت سیدہ خاتونِ جنت سلام اللہ علیہا کے متعلق روایات میں ہے کہ آپؑ شکمِ مادر میں اپنی والدہ سے کلام کرتی تھیں اور انھیں تسلیاں دیتی تھیں۔

بات یہ ہے کہ جس کی صاحب زادی شکمِ مادر میں معارف الٰہی سے واقف ہو تو اس بی بی کے والد محترم کے علم لدنی کا کیا مقام ہوگا؟ البتہ اس مقام پر یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ آپؐ کا علم روزانہ بڑھتا رہتا تھا اور ملکوت الٰہی کے اسرار سے آپ کو روزانہ زیادہ باخبر کیا جاتا تھا۔ اور فلسفۂ معراج میں بھی یہی نکتہ کارفرما ہے۔

معارف الٰہی کی کثرت کی وجہ سے اللہ نے آپ کو تمام مخلوق پر فضیلت دی تھی

اور ائمہ ہدیٰ کی افضیلت کا راز بھی ان کی کثرت علم میں مضمر ہے۔

امامت و عصمت

سوال جناب عالی! کیا امام کو علم شریعت و احکام و تفسیر کے علاوہ باقی علوم کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اگر جواب نفی میں ہے تو ہم یہ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ امام ہر چیز کے علم میں اعلم الناس ہوتا ہے؟

جواب اس مسئلہ پر ہم نے اپنی کتاب "مخلفیات ما سا ۃ الزہراء" میں تفصیلی بحث کی ہے۔ یہاں ہم بقدرِ ضرورت چند معروضات پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنا جانشین بنایا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انسان صحیح اصول و ضوابط کے تحت زمین کو آباد کرے۔ اس کے لیے خدا نے اسے عقل و ارادہ جیسی قوتیں عطا کی ہیں اور انسان ان سے استفادہ کر کے عظیم اہداف حاصل کر سکتا ہے اور زمین کے علاوہ دوسرے کرّوں تک بھی پہنچ سکتا ہے اور زہرہ و مریخ پر کمندیں ڈال سکتا ہے۔

اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ انسان آزاد اور خودمختار ہو اور اس کے لیے میدان کھلا ہو تا کہ وہ اپنی مرضی اور ارادہ سے قدم بڑھائے۔ پھر اللہ کے لطف و کرم کا یہ تقاضا ہوا کہ وہ انسان کو تن تنہا نہ چھوڑے۔ اس کی رہنمائی کے لیے کوئی نہ کوئی ہادی ہونا چاہیے جو اس کی رہنمائی کرے اور اس کی نگرانی کرے۔

چنانچہ اللہ نے انبیاءؑ و اوصیاءؑ کو اس الٰہی امانت کا امین مقرر کیا۔ چنانچہ انھیں انسانوں کا قیم اور گواہ مقرر کیا اور امانت الٰہی کے اُٹھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خدا انھیں ایسے وسائل اور اختیارات عطا کرے جن سے وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

انبیاءؑ کی ذمہ داری صرف ہدایت و رہنمائی تک محدود نہیں ہے۔ ان کی ذمہ

داری میں تعلیم و تربیت، سیاست، قیادت اور انسان کی تدبیر بھی شامل ہے۔ خدا نے انھیں کائنات کی ہر چیز پر نگران مقرر کیا ہے یہاں تک کہ وہ چیونٹیوں، پرندوں اور صحراؤں کی مخلوقات اور شجر و حجر اور جن وانس پر بھی نگران ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان بن داؤد ایک چیونٹی سے ہم کلام ہو رہے ہیں۔ یہ ہم کلامی ایسے تو نہیں ہو جاتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ چیونٹیوں کی آواز بھی سنتے تھے اور ان کی زبان کو بھی جانتے تھے۔ آپ نے ہدہد پرندے سے گفتگو کی تھی۔

حضرت سلیمانؑ نے وضاحت کی کہ ہمیں ہر چیز عطا کی گئی ہے اور ہمیں پرندوں کی بولی تعلیم دی گئی ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ

''لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے اور ہمیں ہر چیز عطا کی گئی ہے''۔(النمل:۱۶)

ہر چیز سے مراد یہ ہے کہ خدا نے ہمیں موجودات پر قدرت عطا کی ہے۔ جس کے تحت انسانوں کے ساتھ ساتھ جنات بھی ہمارے اطاعت گزار ہیں اور پرندے ہمارے فرمان کے تابع ہیں۔ ہوا ہمارے حکم پر چلتی ہے۔ پہاڑ ہمارے ساتھ تسبیح خوانی کرتے ہیں۔ ہم سب کی زبانیں جانتے ہیں اور سب پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ہم چاہیں تو سرکش جنات کو زنجیروں میں جکڑ دیں اور ہم چاہیں تو جنات سے غواصی کرائیں۔ ہم پر یہ سب خدا کی عطا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے تصرف کا کمال یہ تھا کہ آپؑ نے جنات سے بھی جنگ کی تھی۔

شیخ مفید لکھتے ہیں کہ یہ روایت سنّی شیعہ دونوں کی نظر میں صحیح ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم احادیث کی کتابوں میں یہ پڑھتے ہیں کہ نبی و امام تمام مخلوق پر شاہد ہیں تو ہمیں اس سے کوئی تعجب نہیں ہوتا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام صرف علومِ شریعت تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ خدا اسے ایسے علوم و معارف بھی عطا کرتا ہے جو دوسرے انسانوں کے بس میں نہیں ہوتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امام خدا کی طرف سے لوگوں کے اعمال کا شاہد ہوتا ہے اور وہ لوگوں کا نگران ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ خدا کی عطا کردہ قوتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کے لیے اسے کسی معجزہ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اگر ہر جگہ معجزے سے کام چلتا تو سلیمانؑ کو پرندوں کی زبان کی تعلیم کیوں دی جاتی؟ وہ معجزہ کے زور پر پرندوں کی بولیوں کو سمجھ لیتے۔

اگر ہر جگہ معجزے کی ضرورت ہوتی تو خدا انھیں ہر چیز کیوں عطا کرتا؟ اگر معجزہ ہی کافی ہوتا تو ہدہد کو ملکِ سبا کی ملکہ کے پاس سفیر بنا کر کیوں بھیجا جاتا؟ حضرت سلیمانؑ معجزہ سے ہی ہر بات خود جان سکتے تھے۔

اگر ہر جگہ معجزہ ہی کارفرما ہوتا تو آپ کو تختِ بلقیس منگوانے کے لیے نہ تو ''عفریت'' کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی اس مردِ خدا کے محتاج ہوتے جسے کتاب کا کچھ علم عطا کیا گیا تھا۔

اس کی بجائے آپ معجزہ سے ہی تختِ بلقیس منگوا لیتے۔ اسی طرح سے آپ کو محراب و مجسموں کی تعمیر کے لیے جنات کی ضرورت نہ پڑتی اور آپ کو سمندر سے موتی نکالنے کے لیے غوطہ خور جنات کی احتیاج ہی محسوس نہ ہوتی۔ سب کام معجزہ کے زور سے کرا لیتے۔

یقیناً ان تمام باتوں کے لیے امام و نبی کو علمِ شریعت کے علاوہ کچھ اور علوم کی

بھی ضرورت ہوتی ہے جو خدا انھیں عطا کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ امام صرف احکامِ شریعت اور تفسیر کا عالم ہوتا ہے۔ باقی علوم سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

علمنی رسول اللّٰہ الف باب من العلم یفتح لی من کل باب الف باب

"رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مجھے علم کے ہزار دروازوں کی تعلیم دی تھی اور پھر ہر دروازے سے ہزار دروازہ کھول دیا گیا"۔

روایات میں مذکور ہے کہ امام کے لیے ایک مینارِ نور بلند کیا جاتا ہے جس سے وہ بندوں کے اعمال کا مشاہدہ کرتا ہے۔

علمِ آئمہ

سوال جناب عالی! کیا تمام آئمہ یکساں علم کے مالک ہیں؟ اور کیا وہ تمام مسائل کا جواب دے سکتے ہیں؟ اور کیا وہ جدید علوم سے بھی آگاہی رکھتے ہیں؟

جواب مذکورہ سوال کا جواب حسب ذیل نکات میں پیش کیا جاتا ہے:

۱) احادیث میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر اور حلال و حرام کا علم اور امامت کے لیے جتنے علوم کی ضرورت ہے اس میں تمام آئمہ یکساں حیثیت کے مالک ہیں۔ احادیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے پاس تمام سابقہ واقعات کا علم ہے اور ان کے پاس مستقبل کا علم ہے اور انھوں نے رسولؐ خدا سے علم ما کان وما یکون الی یوم القیامۃ بطور میراث حاصل کیا ہے۔

۲) روایات بتاتی ہیں کہ جب امام کسی چیز کو جاننے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے قدرت کی طرف سے باخبر کر دیا جاتا ہے۔

۳ روایات بتاتی ہیں کہ آئمہ کے علم میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس علم سے انھیں مخصوص کرتا ہے پہلے وہ علم رسولؐ خدا پر اُتارا جاتا ہے، پھر ترتیب وار آئمہ کو اس سے مطلع کیا جاتا ہے۔ آخر میں جو امامِ زمانہؑ ہوتا ہے اسے اس سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

اس موضوع کے لیے الکافی کی کتاب الحجۃ، بصائر الدرجات اور بحار کا مطالعہ فرمائیں۔ وہاں آپ کو اس عنوان کی دسیوں احادیث دکھائی دیں گی۔

کیا ابن العربی شیعہ تھا؟

سوال جناب عالی! ابن سینا، ابن عربی اور شیخ احمد احسائی کے علمی، فلسفی اور فقہی کتب کے متعلق کیا نظریہ رکھنا چاہیے؟ خاص طور پر ہم ابن العربی کے متعلق دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ امام خمینیؒ نے اس کی کتاب فصوص الحکم کی شرح لکھی۔ علاوہ ازیں محمد حسین تہرانی نے اپنی کتاب "الروح المجرد" میں ابن العربی کی بڑی تعریف وتوصیف کی ہے اوران کے کچھ اشعار کی تشریح بھی کی ہے۔ انھوں نے ابن العربی کے کچھ اشعار سے یہ استدلال کیا ہے کہ وہ دوازدہ ائمہ کی امامت پر یقین رکھتے تھے۔

آپ سے التماس ہے کہ ابن العربی اوران کے ہم نوا صوفیا کے متعلق وضاحت فرمائیں۔

جواب جہاں تک ابن العربی کے تشیع یا تسنن کا تعلق ہے تو اس کو سمجھنے کے لیے دوازدہ خلفاء کی حدیث پر نظر رکھنی چاہیے۔

اہلِ سنت کی صحاح اور ان کی معتبر کتابوں مثلاً بخاری، مسلم، سنن ابی داؤد، مسند احمد بن حنبل اور دوسری کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے

فرمایا: میرے بعد بارہ خلفاء ہوں گے۔ ان سب کا تعلق قریش سے ہوگا۔ بعض روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کا تعلق بنی ہاشم سے ہوگا۔

قندوزی حنفی بیان کرتے ہیں کہ یہ روایت بیس سے زیادہ صحابہ سے منقول ہے۔

اس حدیث نے علمائے اہلِ سنت کو حیران کر دیا ہے اور انھوں نے اس کی تشریح میں مختلف باتیں کہی ہیں۔

اس حدیث کے تحت کچھ سُنّی علماء نے بارہ آئمہ کے حالات لکھے اور ان کی کرامات اور سیرت کو نقل کیا ہے اور لکھا کہ وہ دین کے حقیقی امام تھے اور اللہ کے سچے ولی تھے۔ الغرض سُنّی اور شیعہ علماء ائمہ اثنا عشر کی تعریف میں رطب اللسان دکھائی دیتے تھے۔

بہت سے سُنّی علماء نے آئمہ اثنا عشر کی سیرت پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں شبلنجی کی کتاب نورالابصار، قندوزی حنفی کی کتاب ینابیع المودۃ اور گنجی کی کتاب کفایۃ الطالب اور سبط ابن جوزی کی کتاب تذکرۃ الخواص کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ آئمہ اثنا عشر کی تعریف وتوصیف کرنے والے لوگوں میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جنھوں نے مذہبِ شیعہ اور عقائدِ شیعہ کی کھل کر تردید کی تھی اور ان میں مذہبِ شیعہ کے بدترین مخالف بھی تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں فضل بن روزبہان بھی شامل ہے۔ اس نے جہاں علامہ حلّی کی تردید کی تھی وہاں اس نے آئمہ اثنا عشر کی سیرت پر کتاب بھی لکھی تھی جس میں اس نے آئمہ کرام کے فضائل و کرامات نقل کیے۔

اسی طرح سے ابن حجر مکّی بھی ایک متعصب سُنّی تھا۔ اس نے شیعیت کی رد میں "صواعق محرقہ" نامی کتاب لکھی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس نے "صواعق محرقہ" میں ہی بارہ آئمہؑ کے حالاتِ زندگی بھی لکھے تھے۔

یاد رکھیں ائمہ اہلِ بیتؑ کے کردار سے متاثر ہونا اور بات ہے لیکن شیعہ ہونا اور

بات ہے۔ وہ سنّی علماء جنھوں نے ائمہ ہدیٰ کی سیرت و فضائل پر کتابیں لکھی تھیں انھوں نے خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے اثبات پر بھی کتابیں لکھی تھیں۔ اس کی واضح مثال فضل بن روز بہان اور ابن حجر مکّی ہیں۔

اور یہی حال ابن ابی الحدید کا ہے۔ وہ بغداد کے معتزل عالم تھے اور وہ حضرت علیؑ کی تفضیل کا عقیدہ رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی ضخیم مجلدات میں نہج البلاغہ کی شرح لکھی مگر اس کے باوجود وہ خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے شدومد سے قائل تھے۔

بعض شیعہ برادران جب ایسے ہی لوگوں کی کتابوں میں فضائل اہلِ بیتؑ کا مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ یہ شیعہ ہیں حالانکہ وہ شیعہ نہیں ہوتے۔

یہی حال ابن العربی اور اس کے ہم نواؤں کا ہے۔ وہ خلفائے اربعہ کو زمین کے چہارگانہ سمجھتے تھے مگر کہیں کہیں اہلِ بیتؑ کی تعریف بھی کیا کرتے تھے۔

صوفیا کی ایک مجبوری یہ ہے کہ یہ لوگ غوث، قطب، ابدال و اوتاد کے قائل ہیں اور یہ لوگ ولایت پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ ان کے ایک سلسلہ نقش بندی کے علاوہ باقی تمام سلسلے ان کے بزرگوں کے ذریعہ سے حسن بصری سے متصل ہوتے ہیں اور صوفیا کے بقول حسن بصری نے ولایت کا فرقہ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے حاصل کیا تھا۔[1]

صوفیا کی نظر میں حضرت علی علیہ السلام کو بابِ ولایت کی حیثیت حاصل ہے اسی لیے وہ آپ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں مگر صوفیا اوّل و آخر سنّی ہیں،

---

[1] تصوف اور تشیع کے فرق کے لیے علامہ ہاشم معروف الحسینی کی معرکتہ الآرا کتاب بین التصوف والتشیع کا مطالعہ کریں۔ حقیر نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور کچھ عرصہ قبل یہ کتاب "تصوف اور تشیع کا فرق" کے نام سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ انتہائی تحقیقی کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ بہت ہی مفید ثابت ہوگا۔ (مترجم اُردو عفی عنہ)

انھیں شیعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہی حال ابن العربی کا ہے۔ اگرچہ اس نے ائمہ ہدیٰ کی تعریف و توصیف بھی کی ہے۔ پھر بھی وہ سنّی ہے۔ بہت سے شیعہ علماء نے اس پر سخت تنقید کی ہے۔

یاد رکھیں تشیع اس بات کی محتاج نہیں ہے کہ ابن العربی شیعہ ہو۔ ہمیں افراد سے کوئی غرض نہیں ہے اور یہ موضوع ویسے بھی غیر ضروری ہے ممکن ہے کہ یہ موضوع امام زمانہ صلوات اللہ علیہ کو ناپسند ہو۔

معصوم کی ولایت تکوینی کا مفہوم

سوال جناب عالی! مخالفین کہتے ہیں: شیعہ معصومینؑ کی ولایت تکوینی کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ معصومینؑ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ امور تکوینیہ جیسے چاہیں بجا لائیں۔ انھیں اس کے لیے خدائی مشیت کی بھی ضرورت نہیں پڑتی اور یہ عقیدہ صریحاً شرک ہے۔ اس کے متعلق آپ کا نظریہ کیا ہے؟

جواب میرے علم کے مطابق دنیا میں ایک بھی شیعہ عالم دین ایسا نہیں گزرا جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ انسان (بشمول انبیاء و اوصیاء) کو ذاتی طور پر امور تکوینی سرانجام دینے کا اختیار حاصل ہے۔

اور اگر بالفرض کسی کونے کھدرے سے ایسا شخص نکل بھی آئے تو اس کی بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ کسی بھی مذہب کا نظریہ جمہور علماء سے اخذ کیا جاتا ہے، کسی ایرے غیرے سے اخذ نہیں کیا جاتا۔

ولایت تکوینی سے مراد یہ ہے کہ معصوم (نبیؐ و امامؑ) کا ارادہ ارادۂ الٰہی کے تحقق پذیر ہونے کی بنیاد پر ہوتا ہے مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبروص اور پیدائشی

اندھوں کو تندرست کیا کرتے تھے۔ شفا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے لیکن اس میں عیسیٰؑ کے ارادہ کا عمل دخل بھی ہے۔ اس کی ایک اور مثال یوں ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (الزمر:۴۲)

"اللہ ہی جانداروں کو وفات دیتا ہے"۔

یہ آیت مجیدہ واضح کر رہی ہے کہ وفات دینا خدا کا فعل ہے مگر قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (السجدہ:۱۱)

"آپ کہہ دیں کہ تمھیں وہ موت کا فرشتہ وفات دے گا جو تم پر موکل کیا گیا ہے"۔

یہی حال زراعت کا ہے۔ اصلی زارع اللہ ہے لیکن اس میں کسان اور زمین کا بھی عمل دخل شامل ہے۔ مریض کو شفا بخشنے والا اللہ تعالیٰ ہے لیکن اس میں دعا اور دوا کی بھی اپنی اہمیت ہے۔

بارش برسانے والا خدا ہے لیکن نماز استسقا کی بھی اپنی اہمیت ہے۔

معصومین جو کچھ امور تکوینی سرانجام دیتے ہیں وہ خدا کی عطا کردہ قوت سے ہی ایسا کرتے ہیں لہٰذا اس میں کسی طرح کے شرک کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

حُبُّ عَلِيٍّ حَسَنَةٌ کی تشریح

سوال جناب عالی! حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے: حب علی حسنة لا تضر معها سيئة،

"علیؑ کی محبت نیکی ہے اس کی موجودگی میں کوئی برائی نقصان نہیں پہنچاتی"۔

اس حدیث کی تشریح میں غالباً حضرت بیہانی نے یہ لکھا ہے کہ
اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی محبت
ارتکابِ معصیت میں رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے۔ اس کا یہ مفہوم
نہیں ہے کہ محبت علیؑ کی موجودگی میں کوئی گناہ نقصان ہی نہیں
پہنچاتا۔

التماس ہے کہ اس حدیث کی تسلی بخش وضاحت فرمائیں۔

جواب کچھ گناہ ایسے بھی ہیں جو نیکیوں کو ختم کر دیتے ہیں اور ان کی وجہ سے نیکیاں بے اثر ہو جاتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا
(الفرقان:۲۳)

"ہم ان کے تمام اعمال کو غبار کی طرح اُڑا دیں گے"۔

حبطِ اعمال دراصل بعض اعمال کی جزا ہے، جیسا کہ فرمانِ قدرت ہے:

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (اعراف:۱۴۷)

"وہ لوگ جنھوں نے ہماری نشانیوں اور آخرت کی ملاقات کو
جھٹلایا اس کے سارے عمل ضائع ہو گئے کیا لوگوں کو ان کے
اعمال کے علاوہ کوئی اور جزا دی جائے گی؟"

حبطِ اعمال کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ
اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ (الحجرات:۲)

"نبیؐ کے ساتھ اُونچی آواز سے بات نہ کرو جس طرح سے تم

آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں علم تک نہ ہو"۔

یہ آیت مجیدہ واضح کرتی ہے کہ کفر کے علاوہ بھی کچھ اعمال ایسے ہیں جو نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح سے رسولؐ خدا سے جھگڑا کرنے سے نیک اعمال ضائع ہو جاتے ہیں جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ ○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (محمد:۳۲-۳۳)

"جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور راہِ ہدایت واضح ہونے کے بعد رسولؐ سے جھگڑا کیا تو وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، اللہ ان کے اعمال ضائع کر دے گا۔ اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو"۔

ان آیاتِ مجیدہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسولؐ سے جھگڑنا اعمال کو برباد کر دیتا ہے اور رسولؐ کی اطاعت نہ کرنے سے بھی اعمال باطل ہو جاتے ہیں اور رسولؐ کے ساتھ اونچی آواز سے گفتگو کرنے سے بھی اعمال باطل ہو جاتے ہیں۔

احادیث میں بھی اعمال ضائع ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھتا ہے تو اس کے لیے جنت میں ایک درخت کاشت کر دیا جاتا ہے۔

یہ سنا تو قریش میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا: یارسولؐ اللہ! اگر یہ بات

ہے تو پھر جنت میں ہمارے بہت سے درخت ہوں گے۔

رسولؐ خدا نے فرمایا: خیال کرنا کہیں بگولا بھیج کر انھیں جلا نہ دینا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (محمد:۳۳)

"ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو"۔

اب اس تمہید کے بعد ہم اس حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ رسولؐ خدا نے فرمایا: حب علی حسنة لا تضر معها سيئة "علیؑ کی محبت ایسی نیکی ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی بُرائی نقصان نہیں دیتی"۔

اس سے مراد یہ ہے کہ محبتِ علیؑ کی نیکی کو دوسری برائیاں ضائع نہیں کرسکتیں کیونکہ علیؑ کی محبت اساسِ ایمان اور حقیقتِ دین سے وابستہ ہے۔ علیؑ کی محبت رسولؐ خدا اور اللہ تعالیٰ کی محبت کی طرف لے جاتی ہے۔ اور علیؑ کی محبت عقیدۂ توحید کے شرائط میں شامل ہے۔ جیسا کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے حدیث سلسلة الذہب میں فرمایا تھا:

كلمة لا اله الا الله حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی

"کلمہ لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے اور جو میرے قلعہ میں داخل ہوا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا"۔

پھر آپؑ نے فرمایا: اس کی کچھ شرائط ہیں اور اس کی شرائط میں سے میں بھی ایک شرط ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے منکرِ علیؑ کو کھلے لفظوں میں کافر کہا ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

يَآيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (المائدہ:٦٧)

"اے رسولؐ! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر اُتارا گیا ہے اسے پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کی رسالت کی تبلیغ ہی نہیں کی۔ اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا، بے شک اللہ کافروں کو ہدایت نہیں کرتا"۔

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ حدیث پاک کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؑ کی محبت ایک ایسی نیکی ہے جس کی موجودگی میں کوئی برائی حبطِ اعمال کا سبب نہیں بن سکتی۔

اگر کوئی شخص حدیث کے اس امکانی مفہوم کو یہ کہہ کر رد کرے کہ یہ مفہوم تب صحیح کہلاتا اگر حدیث میں لا تضر بہا کے الفاظ ہوتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث میں لاتضر معھا کے الفاظ وارد ہوئے ہیں لہٰذا مذکورہ بالا تشریح صحیح نہیں ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں ہم یہ گزارشات پیش کرتے ہیں:

انسانوں کی اکثریت کو علیؑ سے محبت نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ محبتِ علیؑ کا دعویٰ کرنے والوں کی اکثریت بھی اس سے خالی ہے۔ علیؑ سے محبت رکھنا اور ہے اور علیؑ کی صفات و خصوصیات سے محبت رکھنا اور ہے۔

اس مسئلہ کو یوں سمجھیں کہ ایک شخص حضرت علیؑ سے اس لیے محبت کرتا ہے کہ آپ سخی تھے۔ ایسا شخص ذاتی طور پر علیؑ سے محبت نہیں رکھتا۔ اسے اگر محبت ہے تو

سخاوت سے ہے۔ حضرت علیؑ چونکہ سخی تھے اسی لیے یہ بھی ان پر فریفتہ ہو گیا۔

اب اگر اسے کوئی اور عظیم الشان سخی دکھائی دے تو یہ اس سے بھی اسی طرح سے محبت کرے گا جیسا کہ وہ حضرت علیؑ سے کرتا ہے۔

اسی طرح سے ایک شخص کو حضرت علیؑ سے اس لیے محبت ہے کہ آپ بڑے جری اور بہادر تھے۔ یقین جانئے کہ اس شخص کو حضرت علی علیہ السلام سے ذاتی محبت نہیں ہے۔ اسے اگر محبت ہے تو جرأت و دلاوری سے محبت ہے اور حضرت علیؑ چونکہ بہت بڑے جری اور بہادر تھے اسی لیے یہ شخص حضرت علیؑ کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔

اب اگر اسے کوئی اور نڈر، جری اور بہادر شخص دکھائی دے گا تو وہ اس سے بھی اسی طرح سے محبت کرے گا جیسا کہ وہ حضرت علیؑ سے محبت کرتا تھا۔ اسے محبتِ صفات کا نام دیا جاسکتا ہے۔ محبت ذات کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ محبتِ علیؑ تو یہ ہے کہ اگر حضرت علیؑ انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر اس کے بیٹے کو قصاص میں قتل کریں تو بھی اس کا دل حضرت علیؑ سے منحرف نہ ہونے پائے۔

محبتِ علیؑ یہ ہے کہ اگر اس شخص پر حضرتؑ کی عدالت میں چوری کا الزام ثابت ہو جائے اور آپ اس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ اس کے باوجود بھی وہ حضرتؑ کی شان میں رطب اللسان رہے تو یہ حضرت علیؑ سے حقیقی محبت ہے۔

اب اگر حضرتؑ کی ذات والا صفات سے حقیقی محبت کرنے والے شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو وہ اس کی تلافی فوراً توبہ سے کرے گا۔ کیونکہ اسے حضرت علیؑ سے محبت ہے اور محبتِ علیؑ کا تقاضا یہ ہے کہ گناہ کا ازالہ توبہ سے کیا جائے اور محبت علیؑ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ وہاں دکھائی دے جہاں حضرت علیؑ اس کو دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ اس مقام پر کبھی دکھائی نہ دے جہاں حضرت علیؑ اپنے محب کو نہیں دیکھنا چاہتے۔ چنانچہ آپؑ کی محبت گناہوں کو چھڑا دیتی ہے اور نیکیوں کی ترغیب دیتی ہے۔ اسی لیے

رسولؐ خدا نے فرمایا تھا کہ علیؑ کی محبت وہ نیکی ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی بُرائی نقصان نہیں دے سکتی۔

قرآن کریم میں حضرت علیؑ کا نام کیوں نہیں ہے؟

سوال جناب عالی! مخالفین کی طرف سے عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت علی علیہ السلام کا نام کیوں نہیں لیا؟

اس کے جواب میں علمائے شیعہ یہ کہتے ہیں کہ آپ کے مخالف اتنے زیادہ تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کا نام لے لیتا تو لوگ قرآن میں تحریف کرتے۔

جناب عالی! علمائے شیعہ کا یہ جواب تسلی بخش معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے اور فرمایا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (الحجر:۱۵)

"بے شک قرآن کو ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔

اس خدائی ضمانت کے بعد مذکورہ جواب کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

جواب علمائے شیعہ کا جواب انتہائی وزنی ہے اور اس پر جو شبہہ وارد کیا گیا ہے وہ کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حفاظتِ قرآن کی ضمانت دی ہے۔ حفاظت قرآن کے دو طریقے ممکن ہیں:

پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ اللہ اپنی قدرتِ کاملہ سے لوگوں کو تحریف سے روک

دے اور ان کے دلوں سے تحریف کا خیال تک نکال دے۔

لیکن یہ طریقہ سنت الٰہی اور مزاج یزدانی کے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اللہ کسی کو مجبور کر کے اپنی بات نہیں منوایا کرتا۔ اگر خدا ایسا کرتا تو یہ لوگوں کی آزادی سلب کرنے کے مترادف ہوتا جو کہ دستورِ الٰہی کے خلاف ہے مثلاً اللہ اپنے حبیبؐ کی حفاظت کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے کفار مکہ کے دلوں سے یہ خیال نہیں نکالا کہ وہ حبیب کا پیچھا نہ کریں۔

نہیں ایسا نہیں ہوا۔ کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعاقب کیا۔ جگہ جگہ تلاش کرنے کی کوششیں کیں اور وہ اس غار کے دروازے پر بھی پہنچ گئے تھے جہاں آنحضرتؐ مخفی تھے۔

اس وقت اللہ نے اسبابِ عمومی سے کام لیا۔ عنکبوت نے جالا تنا، کبوتری نے انڈے دیئے۔ جب انھوں نے عنکبوت کے جالے اور کبوتری کے انڈوں کو دیکھا تو یہ کہہ کر وہاں سے چل دیئے کہ یہاں تو مدت سے کوئی نہیں آیا۔ اس طرح سے اللہ نے اپنے حبیب کی حفاظت کی۔ لہٰذا دستِ تحریف کو اپنی قدرتِ کاملہ سے کاٹ دینا سنتِ الٰہی کے مطابق نہ تھا۔

اس کے برعکس خدا نے قرآن کی حفاظت کے لیے عمومی طریقہ اختیار کیا۔ قرآن کی کچھ سورتوں کو نماز میں شامل کر دیا اور رسولِؐ خدا نے حفظِ قرآن کو عبادت کا درجہ دیا جس سے مسلمانوں میں قرآن یاد کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے مدینہ اور اس کے نواح میں سینکڑوں مسلمان حافظ قرآن بن گئے اور جگہ جگہ تعلیم قرآن کے مدارس بن گئے جس کی وجہ سے تحریف کا خطرہ ٹل گیا۔

اب اگر اللہ تعالیٰ حضرت علیؑ کا نام لیتا تو حسبِ ذیل تین باتوں میں سے ایک نہ ایک کا ہونا ضروری ہو جاتا:

① لوگ حضرت علیؑ کی دشمنی کی وجہ سے بالکل اسلام اور قرآن کو چھوڑ دیتے اور یوں اسلام چند روز میں ہی اپنی جنم بھومی میں ہی گھٹ کر مر جاتا اور خدا ایسا نہیں چاہتا تھا۔

② حضرت علیؑ کے مخالف لوگوں میں یہ مشہور کرتے کہ قرآن میں تبدیلی اور تحریف واقع ہو چکی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کا قرآن کی صداقت سے اعتماد اُٹھ جاتا، لہٰذا یہ طریقہ بھی نامناسب تھا۔

③ اس کی تیسری امکانی صورت یہ ہے کہ لوگ علیؑ کی امامت کو مان لیتے لیکن اس وقت عرب بالخصوص مکہ اور قریش کا کوئی ایسا گھر نہیں تھا جس کے افراد کو حضرت علیؑ نے تہِ تیغ نہ کیا ہو، لہٰذا ان لوگوں سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ حضرت علیؑ کی عظمت کو برداشت کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے حضرت علیؑ کا نام نہیں لیا۔ اس کی بجائے قرآن میں آپ کی صفات کی تعریف کی۔ یوں قرآن بھی تحریف سے بچ گیا اور آپ کا ذکر بھی ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ گیا۔

یہ سوال کچھ نیا نہیں ہے، ائمہ ہدیٰ کے دور میں بھی یہ سوال گردش کرتا رہتا تھا۔ الکافی میں مرقوم ہے کہ ابوبصیر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا: لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے قرآن میں حضرت علیؑ کا نام کیوں نہیں لیا؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا تو اقیموا الصلاۃ کہا۔ یہ نہ بتایا کہ فجر کی دو رکعات، ظہر و عصر اور عشا کی چار رکعات اور مغرب کی تین رکعات فرض ہے۔

نماز کیفیت اور رکعات کو رسولؐ خدا نے بیان کیا۔ اسی طرح سے حج و زکوٰۃ کا حکم قرآن میں دیا گیا۔ اس کی جزئیات رسولؐ خدا نے بیان کیں۔

اگر اس طرح سے رسولؐ خدا کی جزئیات کو لوگوں نے تسلیم کیا تو جن آیات الٰہی کے متعلق رسولؐ خدا نے فرمایا: یہ علیؑ کے متعلق نازل ہوئیں تو پھر مسلمانوں کا فرض ہے کہ اسے بھی تسلیم کریں۔

قسیم النار والجنہ

سوال جناب عالی! احادیث میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؑ قسیم النار والجنہ ہیں۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؑ کی ولایت جنت کا سبب ہے اور ولایت سے انحراف دوزخ کا سبب ہے۔ کیا یہ تاویل درست ہے؟

جواب قسیم النار والجنہ کی یہ تاویل درست نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہی فریضہ قسیم النار والجنہ کہلاتا۔ مثلاً نماز اہم اسلامی فریضہ ہے۔ نماز کی ادائیگی جنت کا سبب اور ترکِ نماز دوزخ کا سبب ہے۔ یہی حال باقی فرائض اسلام کا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر حضرت علیؑ کے قسیم النار والجنہ کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہتا۔

روایات میں حضرتؑ کے "قسیم النار والجنہ" کا یہ مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ آپ قیامت کے دن دوزخ کے کنارے پُل صراط پر کھڑے ہوں گے اور جب کوئی وہاں سے گزرے گا تو آپ دوزخ سے یہ کہیں گے:

هذا لی فدعيه وهذا لك فخذيه

"یہ بندہ میرا ہے، اسے چھوڑ دے اور یہ تیرا ہے اسے پکڑ لے"۔

(بحار، جلد ۳۹/ ۲۱۰، ۱۹۴، ۲۰۳، ۲۰۴)

سورج کا پلٹنا (ردِ شمس)

سوال جناب عالی! ہمارے مخالفین ردِ شمس کے معجزہ پر اعتراض

کرتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ چند وجوہ قابلِ قبول نہیں ہے:

① اس کے راوی فقط شیعہ ہیں اور حضرت علیؑ کی کسی فضیلت کے جب راوی صرف شیعہ ہوں تو وہ قابلِ قبول نہیں ہوتی۔

② اگر سورج پلٹا ہوتا تو نظامِ کائنات ہی اُلٹ جاتا۔ چونکہ نظامِ کائنات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ روایت ہی من گھڑت ہے۔

③ اگر سورج پلٹا ہوتا تو دوسری اقوام کے مؤرخین بھی اس کا ذکر کرتے جب کہ کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ طبع زاد ہے۔

④ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت علیؑ کی نماز قضا ہو گئی ہو؟

التماس ہے کہ ان اشکالات کا تسلی بخش جواب دے کر مطمئن فرمائیں۔

جواب اس اشکال کا ترتیب وار جواب یہ ہے:

① یہ کہنا ہی غلط ہے کہ ردِ شمس کے واقعہ کو صرف شیعوں نے ہی نقل کیا ہے۔ اسے تمام سنی شیعہ علماء نے یکساں نقل کیا ہے۔ طحاوی نے اس واقعہ کی صحت کا اعتراف کیا ہے اور مدینہ منورہ میں مسجد رد الشمس آج بھی موجود ہے۔ اسے ''مسجد فضیخ'' بھی کہا جاتا ہے۔ (وفاالوفا سمہودی، تاریخ مدینہ ابن شیبہ)

کوفہ کے قریب بھی ایک مسجد ہے جو کہ مسجد رد الشمس کے نام سے مشہور ہے اور یہ مسجد اس واقعہ کی یاد میں ہے جب آپ جنگِ صفین سے واپس آرہے تھے۔

② جہاں تک نظامِ کائنات بالخصوص نظامِ شمسی کے مختل ہونے کا سوال ہے تو

اس کا جواب یہ ہے کہ کائنات کا خالق اور مدبر خدا ہے۔ سورج کو حضرت علیؑ نے پلٹایا ہوتا تو اعتراض درست تھا۔ سورج کو خدا نے حضرت علیؑ کی نماز کے لیے پلٹایا تھا اور مدبر کائنات بھی وہی ہے۔ اس نے ایسا انتظام کیا کہ سورج بھی پلٹا اور نظامِ شمسی بھی مختل نہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی صداقت کو ظاہر کرنے کے لیے چاند کے دو ٹکڑے کیے تھے لیکن اس کے باوجود نظامِ شمسی میں کوئی تعطل پیدا نہیں ہوا تھا۔ آنحضرتؐ معراج پر تشریف لے گئے۔ اس سے نظامِ کائنات میں کوئی خلل نہیں پڑا تھا۔

آصف وصی سلیمان نے چشمِ زدن میں تختِ بلقیس سبا سے اٹھا کر یروشلم میں پیش کیا۔ اس سے بھی نظامِ کائنات میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا۔

یقین جانیے اگر حضرت علیؑ کے لیے سورج پلٹ آیا تو اس سے بھی نظامِ کائنات میں کسی خلل پڑنے کا امکان پیدا نہیں ہوتا۔

۳ ردِ شمس کا واقعہ جزیرۃ العرب میں پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں ہے کہ باقی اقوامِ عالم نے بھی اسے دیکھا ہو۔

فرض کریں انھوں نے اس واقعہ کو دیکھا تھا تو اس وقت پورا کرۂ ارض بدترین جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ لکھنا پڑھنا ہی نہیں جانتے تھے۔ بھلا ایسے میں کوئی یہ واقعہ لکھتا تو کیا لکھتا؟

۴ حضرت علیؑ نے نماز ترک نہیں کی تھی۔ آپ نے اشاروں سے نماز پڑھی تھی لیکن وہ "صلاۃ المضطر" کی مانند تھی۔ صلاۃ المضطر میں ڈوبنے والے شخص کی نماز بھی شامل ہے اور جس زمین پر خدائی عذاب نازل ہوا ہو وہاں وصی نبی کے لیے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نبی و وصی عذاب شدہ زمین پر نماز پڑھتے ہی نہیں

تھے۔ اگر وقت نماز آجاتا تو وہ اپنی سواری پر اشاروں سے نماز پڑھتے تھے اور جب عذاب شدہ دھرتی سے باہر آتے تو پھر دوبارہ نماز پڑھتے تھے۔

حضرت زہرا (سلام اللہ علیہا) ائمہ پر حجت ہیں

سوال جناب عالی! حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے منقول ہے:

نحن حجج الله على الناس وفاطمة حجة علينا

"ہم لوگوں پر خدا کی حجت ہیں اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہم پر حجت ہیں"۔

اس حدیث کا کیا مطلب اور مفہوم ہے؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ائمہ ہدیٰ خلق خدا پر حجت ہیں اور حجت کا مفہوم یہ ہے دلالت و بُرہان اتنی واضح ہو کہ اس کے بعد کسی کو عذر کرنے کا موقع نہ ملے اور اس کا قول و فعل سند بن جائے اور اس کی پیروی ہر شک و شبہے سے بلند ہو جائے۔

ائمہ علیہم السلام کا قول و فعل تمام مخلوق کے لیے حجت ہے اور مخلوق کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کے قول و فعل کی اقتدا کریں۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنی حدیث میں یہی درس دیا ہے کہ جس طرح سے ہماری اتباع لوگوں پر فرض ہے۔ اسی طرح سے ہم پر ہماری والدہ ماجدہ کی اتباع فرض ہے۔

علاوہ ازیں معرفت کے کچھ درجات ایسے ہیں جن کے حصول کی انبیاء و آئمہ کو احتیاج رہتی ہے اور انھیں وہ درجات بعض اوقات بلاواسطہ ملتے ہیں اور کبھی بالواسطہ ملتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اپنے غیب سے مطلع کرتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ خدا ان کے لیے حجاب لوح کو ہٹا دیتا ہے لیکن حضرت علی علیہ السلام رسولؐ خدا سے فیض حاصل کرتے تھے۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ سورج کا نور ذاتی ہوتا ہے اور چاند اس کے نور کا انعکاس کرتا ہے۔ بس یہی نبی اکرمؐ اور حضرت علیؑ میں فرق ہے جو براہ راست خدا سے فیض حاصل کرے وہ نبیؐ ہے اور جو نبیؐ کے سینہ سے سینہ ملا کر علم حاصل کر لے وہ امام ہے۔
کچھ ایسے مقامات و معارف بھی ہیں جن کی آئمہ کو احتیاج محسوس ہوتی ہے اور کچھ ایسے ہی معارف کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کو منبع اور سرچشمہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ ائمہ پھر ان مقامات کا فیضان حضرت عصمت کبریٰ سلام اللہ علیہا کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

خادمہ کی طلب اور تسبیح زہرا کا باہمی ارتباط

سوال جناب عالی! احادیث میں ہے کہ حضرت زہراؑ گھر کے کام کاج سے تھک جاتی تھیں۔ انھوں نے اپنے والد محترم سے ایک خادمہ کا مطالبہ کیا تھا تا کہ وہ گھریلو کاموں میں ان کی مدد کر سکے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں خادمہ تو نہ دی اس کے بجائے آپؐ نے انھیں تسبیح کی تعلیم دی جسے تسبیح زہراؑ کہا جاتا ہے۔
سوال یہ ہے کہ خادمہ کی طلب اور تسبیح کی عطا کا باہمی ارتباط کیا ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

جواب تسبیح زہراؑ تین کلمات پر مشتمل ہے: اللہ اکبر چونتیس مرتبہ، الحمدللہ تینتیس مرتبہ اور سبحان اللہ تینتیس مرتبہ۔ اس تسبیح میں یہ اعلان شامل ہے کہ اللہ رب

العزت ہر طرح کی تھکان نقص، احتیاج، فقر و جہالت سے پاک ہے اور اس کی ذات کمال مطلق ہے۔

یہ تسبیح اللہ کی قدرت، استغنا اور علم و کمال کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس تسبیح کا تقاضا یہ ہے کہ تسبیح کرنے والا اپنی حاجت، فقر، تھکان اور کمزوری کا خدا سے ذکر کرے اور اس کی عظمت کے سامنے جھک جائے تا کہ اسے زیادہ سے زیادہ خشوع اور روحانی بلندی نصیب ہو۔

جب تسبیح کرنے والا "الحمدللہ" کہتا ہے تو وہ خدا کی طرف سے بے شمار نعمات کے فیضان پر اس کی ثنا کر رہا ہوتا ہے کیونکہ اللہ خالق، رازق، رؤوف، رحیم، شافی اور قوی العزیز ہے۔

تسبیح کرنے والا اس جملہ کو کئی بار دہراتا ہے تا کہ اس کے دل و دماغ اور احساس وضمیر پر یہ بات نقش ہو جائے۔

جب انسان لفظ "اللہ اکبر" کی تکرار کرتا ہے تو اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ شعور پختہ تر ہوتا ہے کہ ماسوا اللہ کے سامنے خضوع کرنا غیر مناسب ہے اور ماسوی اللہ سے کچھ مانگنا بے فائدہ ہے۔ ہاں اگر احتیاج ہے اور سوال کرنا بھی ہے تو اس سے کیا جائے جو صفات جلال و جمال کا جامع ہے اور وہ ہر وجود سے بزرگ و برتر ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد ہم اب عرض کرتے ہیں کہ حضرت زہراؑ کے مطالبہ اور تسبیح کے ملنے میں بڑی مناسبت پائی جاتی ہے۔ حضرت زہراءؑ نے اپنی کمزوری اور احتیاج کا ذکر کیا تھا، جواب میں تسبیح عطا ہوئی جس میں یہ پیغام دیا گیا کہ اپنے ضعف و ناتوانی کی شکایت قوی العزیز ذات کے سامنے کی جائے کیونکہ وہ کمزوری کو دور کرنے اور حاجت کو پورا کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔

اس مقام پر یہ بتانا ضروری ہے کہ اس تسبیح سے قبل حضرت زہرا کو ان معارف

کی پوری خبر تھی لیکن سیدہؑ کے مطالبہ پر جب انھیں تسبیح عطا ہوئی تو مذکورہ معارف کا فیضان تمام عالمِ اسلام پر ہو گیا۔ جب تک یہ تسبیح باقی رہے گی اور معارف کے فیضان کا سلسلہ باقی رہے گا تو اس کا اجر و ثواب حضرت سیدہؑ کے حضور پہنچتا رہے گا کیونکہ آپ کی وساطت سے یہ معارف دنیا تک پہنچے۔

نواں حصہ

متفرقات

سوال کیا ورلڈ ٹریڈ سنٹر (امریکہ) کی بربادی کا قرآن میں اشارہ ہے؟

جناب عالی! امریکہ کا ورلڈ ٹریڈ سنٹر کیا تباہ ہوا کہ پوری دنیا میں تباہی پھیل گئی۔ قرآن مجید میں اس کی تباہی کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔ واضح رہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے گرنے کا واقعہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو پیش آیا۔ قرآن مجید کی سورۂ توبہ کی اس آیت میں منافقین کی ایک عمارت کے گرنے کا ذکر موجود ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

"کیا وہ مسجد جس کی بنیاد خدا کے تقویٰ اور رضامندی پر رکھی گئی ہے وہ بہتر ہے یا وہ جس کی بنیاد گرنے والے کنارے پر رکھی گئی ہو اور وہ اسے لے کر دوزخ کی آگ میں جا گرے۔ اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

یہ آیت سورۂ توبہ کی ۱۰۹ آیت ہے۔ سورۂ توبہ قرآن کریم کے گیارہویں پارے میں ہے۔ سورۂ توبہ بلحاظ ترتیب قرآن کریم

کی نویں سورت ہے۔ سورۂ توبہ کی ابتدا سے لے کر اس آیت تک ۲۰۰۱ حروف ہیں اور سن ۲۰۰۱ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر تباہ ہوا تھا۔ آیت مجیدہ کا نشان ۱۰۹ ہے اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر بھی ۱۰۹ منزلہ عمارت تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چودہ سو برس قبل کفار کی اس عمارت کے گرنے کی نشان دہی کر دی تھی۔ اس کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟

جواب جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب خرافات اور جھوٹ پر مبنی ہے اور اس کی متعدد وجوہات ہیں:

① اس میں آیت مجیدہ کے ظاہری معنی سے انحراف کیا گیا ہے۔ اس تاویل میں لفظ "حرف ھار" سے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کہا گیا ہے جو کہ ہر لحاظ سے غلط ہے۔

② بھلا اللہ تعالیٰ کو عیسوی کیلنڈر استعمال کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی، وہ اسلامی کیلنڈر کو بھی استعمال کرسکتا تھا۔

③ یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ سورہ کی ابتدا سے لے کر آیت ۱۰۹ تک کے حروف ۲۰۰۱ بنتے ہیں جب کہ اس کے حروف نو ہزار سے بھی کچھ زیادہ ہیں۔ ا

اگر یہ کہا جائے کہ ہماری مراد حروف نہیں ہیں کلمات ہیں تو بھی یہ حساب غلط ہے کیونکہ ابتداء سے لے کر اس آیت تک کلمات کی تعداد ۲۰۶۲ کلمات پر مشتمل ہے۔

مذکورہ تاویل میں یہ کہا گیا ہے کہ آیت نمبر ۱۰۹ ہے اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت کی بھی ۱۰۹ منزلیں تھیں۔ حالانکہ یہ بات بھی جھوٹ ہے کیونکہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی ۱۱۰ منزلیں تھیں۔

ہمیں یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مسلمانوں کو اس کذب و افتراء کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔

اگر قرآن مجید کی آیات کی اس طرح سے تاویل شروع کر دی جائے تو پھر اسلام اور مفاہیم قرآن کا خدا ہی حافظ ہے۔

منگولوں کی تباہ کاریاں

سوال منگول افواج نے ۶۵۶ھ میں بغداد پر قبضہ کیا تھا اور انھوں نے بدترین جرائم کا ارتکاب کیا تھا اور ظلم و بربریت کی نئی تاریخ رقم کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان وحشیوں نے دین، علم اور انسانیت کی بھی کوئی خدمت کی تھی؟!

جواب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ منگولوں نے بدترین جرائم کا ارتکاب کیا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابن کثیر دمشقی جیسے حنابلہ نے انھیں جتنا بدنام کیا اتنے جرائم انھوں نے سرانجام نہیں دیئے تھے۔

ان کے جرائم کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں ابن کثیر، مسعودی اور دیگر اہل قلم حنابلہ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ خدا کی قدرت دیکھئے:

؎ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اسی خاندان کے کچھ سلاطین نے بعد میں اسلام اور نظریہ تشیع قبول کیا تھا۔ ہلاکو خان نے اس دور کے عظیم عالم دین محقق نصیر الدین کی سرپرستی کی تھی۔

محقق نصیر الدین نے مسلمانوں کو علمی سرمائے سے دوبارہ آشنا کیا تھا۔ انھوں نے منگول لشکر کے ہاتھوں لوٹے جانے والے کتب خانوں کی کتابیں واپس کرائیں اور بہت بڑا کتاب خانہ قائم کیا اور مراغہ میں رصدگاہ قائم کی۔

چالیس، چالیسواں اور زیارت چہلم

سوال مومنین کی وفات کے چالیسویں دن خیرات کرنا اور

مومنین کو بلانے کا جو رواج چل نکلا ہے کیا یہ ائمہ اہلِ بیتؑ سے منقول ہے؟ اور کیا شریعتِ اسلامیہ میں یہ پسندیدہ امر ہے؟ جب کہ بعض افراد کہتے ہیں کہ یہ یہودی اختراع ہے۔

جواب حضرت امام حسین علیہ السلام کی زیارتِ اربعین مستحب ہے۔ معصومینؑ سے مروی ہے کہ چہلم کے دن یعنی بیس صفر کے دن مومن کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی زیارت کرنی چاہیے۔

ہادیانِ دین کا فرمان ہے کہ مومن کی پانچ علامات ہیں:

① شب و روز میں اکیاون رکعت نماز کا پڑھنا۔ (وضاحت: نماز پنج گانہ کی سترہ رکعات فرض ہیں، چونتیس رکعات سنت ہیں جس کی تفصیل یہ ہے: دو رکعت سنت فجر، آٹھ رکعت سنت ظہر، آٹھ رکعت سنت عصر، چار رکعت سنت مغرب، عشا کی دو رکعت نماز بشرطیکہ بیٹھ کر پڑھی جائے اور اگر کھڑے ہو کر پڑھی جائے تو پھر ایک رکعت نماز پڑھی جاتی ہے اور اسے ایک رکعت شمار کیا جاتا ہے۔ آٹھ رکعت نمازِ تہجد، دو رکعت نمازِ شفع اور ایک رکعت نمازِ وتر۔ یہ کُل ملا کر اکیاون رکعات بنتی ہیں)

② زیارتِ اربعین

③ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو نماز میں بلند آواز سے پڑھنا۔

④ داہنے ہاتھ میں انگشتری پہننا

⑤ خاک پر سجدہ کرنا۔ (اقبال الاعمال، ص ۵۸۹، تہذیب الاحکام طوسی، جلد ۶/۵۲، مزار مفید، ص ۶۰، الحدائق الناضرۃ، جلد ۱۸/۳۳۷، فقہی المطلب، کتاب الزیارات الملحق بکتاب الحج، وسائل الشیعہ، جلد ۱۴/۴۷۸، مصباح المتہجدین، ص ۷۳۰)

اس فرمان سے واضح ہوتا ہے کہ زیارتِ اربعین کی رسم یہودیوں سے ماخوذ نہیں ہے۔

چالیسویں کی محفل

کسی مرنے والے کی رسومات تعزیت کو چالیسویں دن ادا کرنا بھی کسی طرح سے یہودیت سے ماخوذ نہیں ہے کیونکہ یہودی اپنے مرنے والے کی رسومات تیس دن کے بعد پھر نو ماہ بعد پھر سال کے اختتام پر سرانجام دیتے ہیں۔ (حاشیہ مقتل مقرم، ص ۳۶۵، بحوالہ نہر الذہب فی تاریخ حلب، جلد اوّل/۲۶۷)

زرارہ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: آسمان حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر چالیس دن تک خون بہاتا رہا اور زمین سیاہ ہو کر چالیس دن تک امام مظلومؑ پر روتی رہی اور سورج گرہن اور سرخی کے ذریعہ سے حضرت امام حسین علیہ السلام پر روتا رہا اور ملائکہ چالیس دن تک آپؑ پر گریہ کرتے رہے۔ (مستدرک الوسائل، جلد ۱۰/۳۱۳، کامل الزیارات، ص ۸۱، بحار، جلد ۴۵/۲۰۶)

ویسے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ یہودیوں کا ہر رسم و رواج غلط ہو۔ ان میں بھی دین موسوی کے کچھ صحیح آثار موجود ہو سکتے ہیں جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کے ہاں ملتِ ابراہیم کے کچھ صحیح اثرات باقی تھے۔

چالیس کے حوالے سے کچھ اور روایات ملاحظہ فرمائیں:

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: حضرت یحییٰ بن زکریا کے بعد آسمان کسی پر نہ رویا سوائے حضرت حسین بن علیؑ کے۔ آسمان ان پر چالیس دن تک روتا رہا۔ (بحار، جلد ۴۵/۲۱۱، بحوالہ کامل الزیارات)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی اس مضمون کی کچھ روایات منقول ہیں۔ (بحار، جلد ۴۵/۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۳، بحوالہ کامل الزیارات، الاربعینیات، ص ۱۵۸-۱۵۹، بحوالہ مجمع البیان والمناقب، جلد ۲)

روایات میں مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام چالیس دن تک ہابیل پر روتے رہے تھے۔ (سفینۃ البحار، جلد اوّل/۵۰۴، ناسخ التواریخ، جلد۲/ ۹۷۴، مجمع البحرین)

محمد بن ولید سے منقول ہے کہ صاحب معتبرہ نے اس سے یونس بن یعقوب کی قبر کے متعلق پوچھا کہ یہ کس کی قبر ہے؟ کیونکہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں چالیس دن تک روزانہ اس کی قبر پر پانی چھڑکاؤں۔ (اربعینیات، ص ۱۴۸ بحوالہ لآلی الاخبار ورجال کشی)

سید ہاشم بحرانی اپنی کتاب معالم الزلفیٰ میں لکھتے ہیں: ”جب بھی اللہ نے اپنے کسی نبی کو وفات دی تو چالیس سال تک آسمان اس پر رویا اور جب کوئی عالم باعمل کی وفات ہوتی ہے تو آسمان اس پر چالیس دن تک روتا ہے۔ (اربعینیات، ص ۱۵۷)

بہرنوع چالیسواں منعقد کرنے کے اوّل و آخر یہی مقصد ہوتا ہے کہ مرنے والے کو یاد کیا جائے اور اس کے لئے دعائے مغفرت کی جائے اور تلاوت قرآن کا اسے ہدیہ کیا جائے۔ اس میں بظاہر کوئی عیب نہیں ہے البتہ اسے دین کا حصّہ نہ سمجھ لیا جائے۔

سالانہ یادگار

سالانہ یادگار کے متعلق بہت سی روایات منقول ہیں۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے آٹھ سو درہم کی نوحہ گر خواتین کے لیے وصیت کی تھی جو دس سال تک ایامِ منیٰ میں ان پر گریہ وبَین کریں۔ (بحار، جلد ۹۷/ ۱۶۹، دعائم الاسلام، جلد اوّل/ ۲۳۹)

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہر سال کچھ خواتین کو ساتھ لے کر شہدائے اُحد کی قبروں پر آتی تھیں اور خدا سے شہدا کے لیے دعا و استغفار کرتی تھیں۔ (بحار، جلد ۹۷/ ۱۶۹، دعائم الاسلام، جلد اوّل/ ۲۳۹)

بعض روایات میں مذکور ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے

ایک بیٹے اور ایک بیٹی پر پورا سال نوحہ کیا تھا۔(بحار، جلد ۷۹/۸۴، اکمال الدین، جلد اول/۱۶۲)

القدس کے حدود

سوال جناب عالی! کیا "مسجد اقصیٰ" اور "بیت المقدس" ایک ہی جگہ کے دو نام ہیں؟ اور اس ضمن میں یہ واضح فرمائیں کہ "القدس" کے حدود کیا ہیں؟

جواب پورے شہر کو "القدس" کہا جاتا ہے اور یہ کافی وسیع وعریض شہر ہے۔ اس میں کئی پرانے اور کئی نئے خاندان آباد ہیں۔ "بیت المقدس" اگرچہ اس شہر کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ لیکن اس جزو کے نام پر پورے شہر کو بھی بیت المقدس کہا جاتا ہے۔

بیت المقدس دراصل مخصوص مقدس مقام کا نام ہے جو کہ اکیاون ہزار میٹر رقبہ پر مشتمل ہے۔ اس میں باب حطہ، مسجد عمر، مسجد صخرہ اور قبر سلیمان پائی جاتی ہیں۔

حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں یہ شہر فتح ہوا تھا اور خلیفۂ ثانی معاہدہ کے لیے خود وہاں گئے تھے اور وہاں انھوں نے ایک مسجد تعمیر کی تھی جسے مسجد عمر کہا جاتا ہے جب کہ مسجد صخرہ کو ولید بن عبد الملک نے تعمیر کرایا تھا۔ بنی اُمیہ نے اپنے دورِ حکومت میں "صخرہ" کو بڑی اہمیت دی تھی اور انھوں نے لوگوں کو وہاں کے حج کرنے کا حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس کے گرد طواف کریں اور ستم یہ ہے کہ انھوں نے وہاں منیٰ وعرفات تک بنا ڈالے تھے۔

ہماری نظر میں اُس "صخرہ" کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے کیونکہ وہ قبلہ یہود ہے۔ مسجد عمر اور مسجد صخرہ کے بعد ان پر "مسجد اقصیٰ" کے لفظ کا اطلاق کیا گیا۔ جب کہ اس سے قبل اس مقدس مقام کو لفظ "بیت المقدس" سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

وضاحت: سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے

سفرِ معراج کا ذکر کیا ہے اور اس میں یہ جملے ارشاد فرمائے ہیں:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا...... (بنی اسرائیل: آیہ ا)

''وہ ذات پاک ہے جس نے رات کے وقت اپنے بندے کو سیر کرائی، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک......''

اس آیت مجیدہ میں ''مسجد اقصیٰ'' سے ''یروشلم'' والی مسجد مراد نہیں ہے۔ یہاں اس کا لغوی معنیٰ مراد ہے اور مسجد اقصیٰ کا لغوی معنی ہے: ''آخری نقطۂ سجود''۔

آیت مجیدہ کا یہ معنیٰ ہوگا کہ وہ ذات پاک ہے جس نے اپنے بندے کو رات کے وقت سیر کرائی، مسجدِ حرام سے لے کر آخری نقطۂ سجود تک۔ (اضافۃ من المترجم)

جہاد اور دہشت گردی کا فرق

سوال جناب عالی! جہاد اور دہشت گردی کا فرق بیان فرمائیں۔

جواب جہاد کی دو اقسام ہیں: (۱) جہاد ابتدائی (۲) جہادِ دفاعی۔

جہاد ابتدائی دعوتِ اسلام کی نشر و اشاعت اور ارادۂ الٰہی کو روکنے والی قوتوں کے ختم کرنے کے لیے کیا جاتا ہے اور اس طرح کا جہاد امام علیہ السلام کی غیبت کی وجہ سے ممکن نہیں ہے۔ جہاں تک دفاعی جہاد کا تعلق ہے تو وہ جان، ناموس، مال اور بلادِ مسلمین سے دشمنوں کو دُور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

اس جہاد کا مقصد اندرونی اور بیرونی مقامات پر امن قائم کرنا ہوتا ہے اور اس کا مقصد نظامِ اُمت کی بقا، عمومی سلامتی کا تحفظ اور دین اسلام کی حفاظت ہوتا ہے اور یہ جہاد انسانیت اور شریعت کے دائرۂ کار میں رہ کر کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصود مصالح عامہ اور انسانی عظمت کا قیام ہوتا ہے۔

اس کے برعکس دہشت گردی کا مقصد امن و امان کی تباہی اور ملک میں خانہ

جنگ کو ہوا دینا ہوتا ہے اور ملک وقوم کی بربادی اس کا مقصود ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاد کلمۃ اللہ کے اعلاء کی کوشش ہے جب کہ دہشت گردی تخریب کاری اور فساد فی الارض ہے۔ اور ان دونوں کے مفاہیم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جہاد اللہ کو پسند ہے اور دہشت گردی خدا کو ناپسند ہے۔

بدعت اور بدعتی

سوال جناب عالی! جو شخص حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی طہارت پر طنز کرے اور بی بی کی مظلومیت کا انکار کرے تو کیا اس شخص کو "بدعتی" کہنا صحیح ہے؟

اور کیا بدعتی کے لیے احادیث میں جو مذمت وارد ہوئی ہے ایسا شخص اس مذمت کا مصداق ہے؟

جواب بدعت سے مراد ہر وہ امر ہے جس کے متعلق نص موجود نہ ہو، پھر بھی اسے دین میں داخل کر دیا گیا ہو، یا جس کام سے ممانعت وارد ہوا سے دین میں داخل کرنے کو بدعت کہا جاتا ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک شخص یہ کہے کہ فلاں وقت میں ستر بار لا الہ الا اللہ الا اللہ کہنا مستحب ہے۔ یا فلاں مقام پر ستر بار لا الہ الا اللہ کہنا مستحب ہے۔ لا إلہ الا اللہ کہنا بذات خود ایک پسندیدہ امر ہے لیکن جس خصوصیت کا دعویٰ کیا گیا ہے وہ ثابت نہیں ہے لہٰذا اس خصوصیت کو "بدعت" کہا جائے گا۔ بدعت ہمیشہ ہی حرام ہوتی ہے کیونکہ اس میں صاحب شریعت کی طرف ایسی چیز منسوب کی جاتی ہے جو اس نے نہیں کہی ہوتی۔

ہم بعض مذاہب کے پیروکاروں کے اس نظریہ سے اتفاق نہیں کرتے کہ بدعت کی پانچ اقسام ہیں اور یہ کہ بدعت کی ایک قسم بدعت حسنہ (اچھی بدعت) ہے

اور ایک قسم "بدعت سیئہ" ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ بدعات کی یہ تقسیم اس لیے عمل میں لائی گئی ہے کہ اپنی ایجاد کردہ کچھ بدعات کو سندِ جواز دی جاسکے۔ چنانچہ بدعت جہاں بھی ہے اور جس بھی شکل میں ہے وہ قابلِ مذمت ہے کیونکہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

کل بدعة ضلالة و کل ضلالة سبیلها الی النار

"ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا راستہ دوزخ کی طرف جاتا ہے"۔

حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ کا کوئی فرق نہیں رکھا تھا اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کیونکہ دین میں نیا اضافہ کبھی بھی مستحسن نہیں ہوتا۔

بدعت کا تعلق گناہانِ کبیرہ سے ہے اور بدعتی شخص خدا کی نظر میں مبغوض ہے۔ ہادیانِ دین نے بدعتی کی شدید مذمت کی ہے۔ چنانچہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جب میری اُمت میں بدعات نمودار ہو جائیں تو عالم کو چاہیے کہ وہ اپنے علم کا اظہار کرے ورنہ اس پر اللہ اور ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جو بدعتی کو خوش کرنے کے لیے اس کے سامنے مسکرایا تو اس نے اپنے دین کو منہدم کرنے میں اعانت کی۔

ایک اور روایت میں مذکور ہے: جو شخص کسی بدعتی شخص کے پاس گیا اور اس کا احترام کیا تو وہ یہ سمجھے کہ وہ اسلام کو منہدم کرنے کے لیے گیا۔

ان معروضات کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں اہلِ بیتؑ کی طہارت کی سند موجود ہے اور حضرت زہرا سلام اللہ علیہا جملہ مسلمانوں کے اجماع کے

ساتھ اہلِ بیت طہارت کی فرد کامل ہیں۔ لہٰذا حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی طہارت پر کسی بھی قسم کا شک کرنا یا طنز کرنا قرآن کی تکذیب ہے اور قرآن کی تکذیب کرنے والا کافر ہے۔

ناصبیت اور نواصب

سوال جناب عالی! ایک اسلامی یونیورسٹی کے پروفیسر نے اپنی گفتگو میں کہا کہ یہ سچ ہے کہ ناصبی (اہلِ بیتؑ کے کھلم کھلا دشمن) اچھے نہیں ہیں لیکن فقہ جعفریہ میں ان پر نجاست کے جو احکام نافذ کیے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ فقہ جعفری میں ان پر جو احکام نافذ کیے گئے ہیں وہ دراصل نواصب کے اس ظلم و ستم کا ردعمل ہے جو انھوں نے اہلِ بیتؑ اور ان کے پیروکاروں پر روا رکھا تھا۔

واضح رہے کہ مذکورہ شخص اپنے آپ کو شیعہ بھی کہتا ہے۔ نواصب کے متعلق ہادیانِ دین کے کیا فرامین ہیں انھیں واضح فرمائیں۔

جواب ① پروفیسر صاحب کی یہ گفتگو غیر محل ہے اور اس کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ شیعہ فقہاء نے ردعمل کے طور پر نواصب کو نجس لکھا ہے۔ اس کے لیے پروفیسر صاحب کو چاہیے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ شیعہ فقہا کا یہ فتویٰ ردعمل پر مبنی ہے۔ کیا انھوں نے شیعہ فقہا کے دلوں میں جھانک کر یہ دیکھ لیا ہے؟!

② اگر نواصب کے نجس ہونے کا فتویٰ ردعمل کا شاخسانہ ہے تو کیا کفار و مشرکین کی نجاست کا فتویٰ بھی ردعمل کی بنیادوں پر جاری کیا گیا ہے؟ اور قرآن کریم اور احادیث میں ان کے متعلق جو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مساجد میں نہ آئیں اور ان سے رشتہ کرنا ممنوع ہے تو کیا یہ بھی کسی ردعمل کا شاخسانہ ہے؟

۳ اگر پروفیسر صاحب اپنے آپ کو شیعہ کہلاتے ہیں اور ائمہ ہدیٰ کی امامت پر یقین رکھتے ہیں تو پھر انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ نواصب کی نجاست کا فتویٰ امامیہ فقہاء نے کسی ردعمل کے طور پر جاری نہیں کیا۔ انھوں نے یہ فتویٰ ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے فرامین کو مدنظر رکھ کر جاری کیا ہے۔ نواصب کے متعلق ہادیانِ دین کے چند فرمان حسب ذیل ہیں:

۱ ثواب الاعمال میں ابوبصیر سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: شراب کا رسیا بت پرست کی مانند ہے اور آلِ محمدؐ سے عداوت رکھنے والا اس سے بھی بدتر ہے۔

راوی کہتا ہے: میں نے عرض کیا کہ ناصبی شرابی سے کس طرح سے بدتر ہے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: شرابی کی کسی نہ کسی دن شفاعت ہوجائے گی اور وہ نجات پالے گا لیکن اگر تمام اہلِ آسمان وزمین مل کر بھی ناصبی کی شفاعت کریں تو بھی اس کے حق میں شفاعت قبول نہ کی جائے گی۔

۲ ثواب الاعمال کی دوسری روایت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا: اگر جملہ انبیاء وصدیقین اور شہدا اللہ سے یہ درخواست کریں کہ وہ ہمارے دشمن کو دوزخ سے نجات دے تو بھی اللہ تعالیٰ اسے دوزخ سے نجات نہ دے گا۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ نے فرمایا ہے:

ما کثین فیہ ابدا (سفینۃ البحار، جلد ۲۵۱/۸)

"وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

۳ وسائل الشیعہ، جلد اوّل/۲۲۰، علل الشرائع، ص ۲۹۹، تہذیب طوسی، جلد اوّل/۳۷۳ اور الکافی، جلد ۶/ ۴۹۸، ۵۰۳ میں مختلف اسناد سے یہ حدیث حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ جہاں حمام کا پانی جمع ہوتا ہے اس سے وضو مت

کرو کیونکہ اس میں جنابت والے، ولدالزنا اور ناصبیوں کے استعمال کا پانی موجود ہوسکتا ہے جب کہ ناصبی زانی، ولدالحرام سے بھی بدتر ہے۔

علل الشرائع میں مرقوم ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔

ناصبی وہ نہیں ہے جو ہم سے کھلم کھلا عداوت رکھے کیونکہ تمھیں ایک بھی شخص ایسا نہ ملے گا جو کھل کر یہ کہے کہ مجھے محمدؐ و آلِ محمدؐ سے عداوت ہے۔ اصل میں ناصبی وہ ہے جو ہمارے شیعوں سے کھل کر عداوت کرے۔ کیونکہ ہمارے شیعہ ہم سے محبت کرتے ہیں۔

زید القرسی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ناصبی کے لیے تمھارے دل میں نرم گوشہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ بھوکا و پیاسا ہو تو بھی اسے کھانا کھلانا اور نہ پانی پلانا اور اگر وہ جل رہا ہو یا ڈوب رہا ہو اور تم سے مدد مانگے تو اس کی مدد نہ کرنا۔ جو شخص ناصبی کا شکم سیر کرے تو اللہ اس کے شکم کو دوزخ کے انگاروں سے بھر دے گا۔ خواہ وہ معذب ہو یا مغفور ہو۔

سرائر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ تمھیں ناصبی کا مال جہاں ملے لے لو۔ اس میں سے خمس نکال کر ہمارے پاس بھیج دو۔

ائمہ علیہم السلام سے منقول ہے کہ جس نے ناصبی کو خوشی دی اور جس نے اس سے بھلائی کی تو ایسا شخص ہم سے بَری ہے اور خدا کی طرف سے دوزخ کا حق دار ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ولد الحرام، یہودی، نصرانی، مشرک اور ہر مخالفِ اسلام کے جھوٹے پانی سے کراہتے تھے اور سب سے زیادہ ناصبی کے جھوٹے سے نفرت کرتے تھے۔ (الوسائل، جلد اوّل، ص ۲۲۹)

خلیفۂ اوّل اور لفظ صدیق

سوال جنابِ عالی! خلیفہ اوّل "صدیق" سے ملقب ہیں تو کیا

یہ ان کی فضیلت کی دلیل نہیں ہے؟

جواب ① اگر یہ لقب انھیں خدا اور رسولؐ خدا کی طرف سے عطا ہوا ہوتا تو یقیناً یہ ان کے لیے بڑا اعزاز ہوتا لیکن انھیں یہ لقب نہ خدا کی طرف سے ملا ہے اور نہ ہی حبیب خدا کی طرف سے ملا ہے۔ البتہ ان کے چاہنے والوں نے انھیں اس لقب سے ملقب کیا ہے اسی لیے یہ لفظ ان کے لیے باعثِ اعزاز نہیں ہے کیونکہ "پیراں خود نہ پرند مریداں می پرانند"۔

② لقب صدیق کے لیے کتب اہلِ سنت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک روایت کہتی ہے: جب رسولؐ خدا مبعوث ہوئے اور خلیفہ نے آپ کی تصدیق کی تو رسولؐ خدا نے انھیں اس پر صدیق کا لقب عطا کیا۔

ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ رسولؐ خدا معراج سے تشریف لائے تو حضرت ابوبکر نے آپ کی تصدیق کی جس کی وجہ سے انھیں صدیق کا لقب ملا۔

ایک روایت یہ کہتی ہے کہ جب رسولؐ خدا معراج پر تشریف لے گئے تو آنحضرتؐ نے دیکھا کہ آسمان پر یہ جملہ لکھا ہوا تھا...... ابوبکر الصدیق۔

ہم نے اپنی کتاب "الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم" میں یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر کافی دیر بعد ایمان لائے تھے اور حد یہ ہے کہ انھوں نے واقعۂ معراج کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔

③ کتب اہلِ سنت گواہی دیتی ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے مسجد بصرہ کے منبر پر یہ اعلان کیا تھا:

انا الصدیق الاکبر امنت قبل ان یؤمن ابوبکر......

واسلمت قبل ان یسلم ابوبکر......

"میں ہی صدیق اکبر ہوں، میں نے ابوبکر سے پہلے ایمان و

اسلام قبول کیا تھا۔ آپؑ نے فرمایا: انا الصدیق الاکبر لا یقولها بعدی الا کذاب مفتری...... میں ہی صدیق اکبر ہوں، میرے بعد جو بھی دعویٰ کرے تو وہ کذاب اور مفتری ہے"۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

هذا الصدیق الاکبر وهذا فاروق هذه الامة یفرق بین الحق والباطل

"یہ صدیق اکبر ہے اور یہ اس اُمت کا فاروق ہے، یہ حق و باطل میں تفریق کرتا ہے"۔

الغرض اس سلسلہ کے لیے بہت سی روایات موجود ہیں۔ ہم نے ایسی تمام روایات کو اپنی کتاب الصحیح من سیرة النبی الاعظم کی جلد چہارم کے صفحات ۴۴ تا ۵۰ میں جمع کیا ہے۔

اگر حضرت علیؑ کے علاوہ کوئی اور صدیق اکبر ہوتا تو آپؑ یہ کیوں کہتے کہ میں ہی صدیق اکبر ہوں، میرے علاوہ جو بھی یہ دعویٰ کرے تو وہ جھوٹا ہے۔

۳ اگر حضرت ابوبکر کو رسولؐ خدا نے "صدیق" کا لقب عطا کیا ہوتا تو وہ سقیفہ کے اجلاس میں اسے انصار کے سامنے ضرور پیش کرتے۔ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کی فضیلت کے لیے یہ کہا تھا کہ یہ بزرگوار آنحضرتؐ کے ساتھ غارِ ثور میں موجود تھے اور اگر رسولِ اکرمؐ نے انھیں صدیق کا لقب عطا کیا ہوتا تو پہلے تو خود آپ بیان کرتے ورنہ حضرت عمر ضرور بیان کرتے اور یہ استدلال "یارِ غار" ہونے کے استدلال سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سقیفہ میں نہ تو حضرت ابوبکر نے یہ دعویٰ کیا تھا اور نہ ہی

ان کے کسی ساتھی نے یہ دعویٰ کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک آپ کو یہ "اعزاز" نصیب نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ اعزاز ان کو ان کی وفات کے بعد ان کے چاہنے والوں نے دیا ہوگا۔

صدیق ہونا ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ اگر رسولؐ خدا نے انھیں یہ اعزاز دیا ہوتا تو وہ سقیفہ میں اسے ضرور بیان کرتے۔ ویسے بھی شادی کے بعد عطر لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سقیفہ میں انصار مدینہ کے سامنے یہ استدلال یوں کیا جاسکتا تھا کہ دیکھو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے نبی تھے۔ اب وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ آیئے قرآن کریم سے پوچھیں کہ انبیاء کے بعد رُتبہ اور مرتبہ کس کا ہوتا ہے؟

قرآن مجید واضح اعلان کر رہا ہے: من النبیین والصدیقین...... انبیاء اور صدیقین۔

گویا قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ انبیاء کے بعد درجہ صدیقین کا ہوتا ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی تھے اور نبی اکرمؐ نے انھیں صدیق فرمایا تھا تو فیصلہ ہوگیا کہ نبی کے بعد درجہ صدیق کا ہے لہٰذا ان کی خلافت کی گواہی قرآن دے رہا ہے۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سقیفہ میں کسی نے بھی یہ دلیل پیش نہیں کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک لفظ صدیق زبان زد عام وخاص نہیں ہوا تھا اور خود بزرگوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم صدیق ہیں۔

۵ نبی اکرمؐ سے یہ روایت بڑی منقول اور مشہور ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

الصدیقون ثلاثۃ حزقیل مؤمن آل فرعون وحبیب النجار صاحب آلِ یاسین وعلی بن ابی طالب......

الثالث افضلھم

"صدیق تین ہیں: ① حزقیل مومن آلِ فرعون ② حبیب النجار صاحب آلِ یاسین ③ علی بن ابی طالب اور یہ تیسرا سب سے افضل ہے۔

یہ کس کی قبر ہے؟

سوال جناب عالی! جنت البقیع مدینہ منورہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرضع حلیمہ سعدیہ کی قبر کے پاس جو قبر ہے وہ کس کی ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خلیفۂ ثالث کی قبر ہے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ رسولؐ خدا کے صحابی عثمان بن مظعون کی قبر ہے۔

آپ واضح کریں کہ کیا یہ حضرت عثمان خلیفۂ ثالث کی قبر ہے یا حضرت عثمان بن مظعون کی قبر ہے؟

جواب ① بقیع غرقد کے پہلو میں ایک احاطہ تھا جسے "حش کوکب" کہا جاتا تھا وہاں یہودی اپنے مُردوں کو دفن کیا کرتے تھے۔ (تاریخ الامم والملوک، جلد ۳/۴۳۸، طبع الاستقامۃ، تاریخ المدینہ ابی شبہ، ص ۱۲۳۰)

جب ابن بجرہ نے حضرت عثمان کو بقیع میں دفن نہ ہونے دیا تو ان کے رشتہ داروں نے انھیں حش کوکب میں دفن کیا۔ (تاریخ المدینہ ابن شبہ، ص ۱۲۳۰، وفاء الوفاء، ص ۹۱۳)

② حش کوکب بقیع غرقد کے پاس ایک جگہ کا نام ہے۔ حموی لکھتے ہیں: جب حضرت عثمان مارے گئے تو ان کی لاش کو وہاں ڈال دیا گیا اور اس کے پہلو میں دفن ہوئے۔ (معجم البلدان، جلد ۲/۲۶۲)

③ جب معاویہ بن ابی سفیان کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے حش کوکب کی

چاردیواری گرا کر اسے بقیع سے متصل کر دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے مرنے والوں کو قبر عثمان کے قریب دفن کریں اور یوں وہ گورستان پھیل کر بقیع میں شامل ہو گیا۔
(تاریخ الامم والملوک، جلد ۳/ ۴۳۸ و ۴۴۰، طبع الاستقامۃ، وفاء الوفاء، ص ۹۱۳-۹۱۴)

۴ حضرت عثمان بن مظعون کی قبر بقیع کے ابتدائی حصّہ میں واقع ہے۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قبر کے پاس اپنے فرزند ابراہیم اور اپنی (ربیبہ) بیٹیوں کو دفن کیا۔ (وفاء الوفا، جلد ۳/ ۸۹۵)

زرارہ پر تنقید کی روایات

سوال جناب عالی! ایک ٹی وی پروگرام میں آیت اللہ العظمیٰ سید خوئی کی کتاب معجم رجال الحدیث، جلد ۸/ ۲۴۵ کے حوالے سے یہ کہا گیا کہ مذکورہ صفحہ پر سید خوئی نے یہ لکھا ہے کہ مجھے تعجب ہے کہ "کشی" اور "نجاشی" نے "زرارہ" کی مذمت میں اس طرح کی بے سروپا روایات کیوں نقل کی ہیں جن سے زرارہ کی عظمت اور ان کا مقام مجروح ہوتا ہے، جب کہ ان روایات کے تمام تر راوی مجہول ہیں۔
سید خوئی کے اس کلام سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ جب راوی مجہول ہوں تو روایت ناقابلِ قبول بن جاتی ہے۔
سوال یہ ہے کہ شیعی احادیث کی کتابوں میں ہمیں بہت سی روایات کے آغاز میں اس طرح کے جملے دکھائی دیتے ہیں:
عن جماعة من اصحابنا یا عدة من اصحابنا عن فلان...... یعنی ہماری جماعت کے کچھ محدثین نے ہم سے بیان کیا۔ وہ کچھ محدثین کون تھے اس کی کہیں کوئی وضاحت موجود

نہیں ہے۔ کیا سید خوئی کے بیان کردہ فارمولے کے مطابق ہم
ان روایات کو ساقط الاعتبار کہہ سکتے ہیں؟

جواب ان دونوں چیزوں میں بڑا واضح فرق ہے۔ سید خوئی نے یہ لکھا کہ زرارہ بن اعین کی مذمت کی روایات جن لوگوں سے منقول ہیں وہ مجہول لوگ تھے۔ مقصد یہ ہے کہ کتب رجال میں ان کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا۔ اسی لیے ہم ان کی روایت کو ساقط الاعتبار قرار دیتے ہیں۔ اور جہاں تک آپ کے اس قول کا تعلق ہے کہ الکافی اور دیگر کتب حدیث میں بعض روایات عدۃ من اصحابنا جیسے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں تو کیا ان روایات کو مجہول رواۃ کی روایت سمجھ کر ساقط الاعتبار سمجھا جا سکتا ہے؟

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح کی روایات کو مجہول رواۃ کی روایت نہیں کہا جا سکتا۔ ثقۃ الاسلام کلینی نے ان کے ناموں کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ علامہ حلی نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میری کتاب الکافی میں جہاں عدۃ من اصحابنا، عن احمد بن محمد بن عیسیٰ مرقوم ہو تو اس جماعت سے میرا مقصود محمد بن یحییٰ، محمد بن موسیٰ الکمیدانی، داؤد بن کورہ، احمد بن ادریس اور علی بن ابراہیم بن ہاشم ہوتے ہیں۔ اور جہاں الکافی میں مَیں نے روایت یوں لکھی ہے:

عدۃ من اصحابنا عن احمد بن محمد بن خالد البرقی

تو اس سے میرا مقصود علی بن ابراہیم، علی بن محمد بن عبداللہ بن اذنیہ، احمد بن عبداللہ اور علی بن حسن ہوتے ہیں۔

اور جب الکافی میں مَیں نے روایت کی سند یوں لکھی ہے:

عدۃ من اصحابنا عن سھل بن زیاد

"تو اس سے میرا اشارہ علی بن محمد بن علان، محمد بن ابی عبداللہ، محمد بن الحسن اور محمد بن عقیل کلینی کی طرف ہوتا ہے"۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الکافی کے مخصوص الفاظ (کوڈ ورڈ) ہیں، لہٰذا ان الفاظ سے روایت کو مجہول رواۃ کی بیان کردہ روایت سمجھنا صحیح نہیں ہے اور اس وجہ سے کسی روایت کو ساقط الاعتبار قرار دینا درست نہیں ہے۔

کیا عقیدہ توحید فطری ہے؟

سوال جناب عالی! کہا جاتا ہے کہ عقیدہ توحید انسانی فطرت میں شامل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو پھر دنیا میں الحاد اور تثلیث کے توحید مخالف نظریات کیونکر وجود میں آئے؟

جواب کائنات میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا ادراک فطرت براہِ راست ادراک کرتی ہے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا ادراک فطرت بالواسطہ کرتی ہے۔ مثلاً انسان فطری طور پر کمال کا طلب گار ہے اور بہتر سے بہتر کا متلاشی ہے۔ اس کا یہ فطری تقاضا اسے صانع حکیم تک لے جاتا ہے اور موجباتِ کمال کی تلاش اسے معصوم کے دروازے تک پہنچا دیتی ہے۔

بعض اوقات گھریلو تربیت اور بیرونی غلط ماحول اس طلب میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان غلط راستوں کا انتخاب کرلیتا ہے۔ پھر غلط انتخاب کبھی الحاد کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی تثلیث کے غیر منطقی نظریہ کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور حدیث پاک میں اسی امر کی طرف ان الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔

کل مولود یولد علی الفطرۃ الا ان ابویه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه

"ہر پیدا ہونے والا فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں"۔

عقل اور روزِ جزا

سوال جناب عالی! کیا آخرت کا اثبات عقل سے ہوتا ہے یا اس کا اثبات آیات و روایات سے ہوتا ہے؟

جواب عقل اس بات کی متقاضی ہے کہ نیکوکار کو اس کی نیکی کا بدلہ ملنا چاہیے اور بدکار کو اس کی برائی کی سزا ملنی چاہیے۔

عقل کا تقاضا ہے کہ ظلم کا خاتمہ ہو اور عدل کا اجرا ہو۔ لیکن عقل یہ معلوم کرنے سے قاصر ہے کہ روزِ عدل کب آئے گا؟ کیا وہ دنیا میں آئے گا یا وہ روزِ مکافات آخرت میں آئے گا یا پھر برزخ میں عدل کے تقاضے پورے ہوں گے؟

عقل اس کے اسلوب اور کیفیت کے ادراک سے قاصر ہے۔ اس مقام پر شریعت آگے بڑھ کر انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ چنانچہ صادق الامین رسولؐ نے ہمیں برزخ، روزِ آخرت، حشر و نشر اور میزان و صراط اور جنت و جہنم کی خبر دی۔ الغرض عقل جزا سزا کا تقاضا کرتی ہے اور شریعت اس کی کیفیت کو نمایاں کرتی ہے۔

کیا ابدی عذاب عدلِ الٰہی سے مطابقت رکھتا ہے؟

سوال جناب عالی! ایک شخص کسی دوسرے شخص کو ناحق قتل کرتا ہے اور مقتول کو اس کی زندگی کے کئی سالوں سے محروم کر دیتا ہے۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک شخص کی عمر ستر سال مقرر تھی لیکن قاتل نے اسے تیس برس کی عمر میں قتل کر دیا اور یوں مقتول اپنی عمر طبیعی کے چالیس سال سے محروم ہو گیا۔ اب قاتل کو ابدی دوزخ کی سزا دینا کیا یہ عدلِ الٰہی سے متصادم نہیں ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ قاتل نے مقتول کو چالیس سال سے محروم کیا تو اسے سزا بھی چالیس سال ملنی چاہیے لیکن اسے لاکھوں کروڑوں سال

کی سزا دینا یہ کون سا عدل ہے؟

اسی طرح سے ایک شخص زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی لذت کے لمحات محدود ہوتے ہیں لیکن اسے ابدی دوزخ کی سزا دی جاتی ہے، آخر ایسا کیوں ہے؟

جواب گزارش یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو ناحق قتل کرتا ہے تو وہ دراصل فرد واحد کو قتل نہیں کرتا۔ وہ انسانیت کا قاتل ہے اور انسانیت کے قاتل کو ابدی سزا دینا قرین عدل ہے۔ قاتل اپنے مقتول کو صرف چند سالوں سے محروم نہیں کرتا بلکہ ان سالوں میں متوقع تمام بھلائیوں سے بھی محروم کرتا ہے۔

بھلا سوچیں اگر ایک قاتل کی وجہ سے مقتول بیس سال کی زندگی سے محروم ہو جائے اور ہر سال میں شب قدر آتی ہے اور اگر وہ مقتول بیس شب ہائے قدر سے محروم ہو جائے تو اس کا نقصان تو شمار کیجیے۔ جب کہ شب قدر ہزار مہینوں جیسی نہیں بلکہ ان سے بھی افضل ہے اور کتنا افضل ہے؟ اس کا علم صرف خدا کے پاس ہے۔ بیس شب ہائے قدر در حقیقت بیس ہزار مہینوں سے بہتر ہیں۔

اس طرح سے ایک قاتل قتل کر کے کسی کو بیس سال سے محروم نہیں کر رہا۔ وہ اس کے ساتھ بیس ہزار مہینوں سے بھی محروم کر رہا ہے۔

اسی طرح سے فرض کریں اگر مقتول زندہ ہوتا اور وہ چند افراد کو راہِ ہدایت دکھاتا تو اسے کتنا اجر نصیب ہوتا۔

قاتل نے صرف مقتول کو ہی نہیں مارا بلکہ کئی افراد کے متوقع ہدایت کنندہ کو بھی قتل کیا ہے، لہٰذا اگر اسے ابدی دوزخ کا عذاب دیا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

اسی طرح سے زانی اور دوسرے جرائم پیشہ افراد کو عذاب ان کی نیت کی وجہ

سے دیا گیا ہے کیونکہ ان کی نیت تھی کہ اگر وہ دنیا میں ہمیشہ رہے تو ہمیشہ ہی بدکاریاں کرتے رہیں گے۔

کیا اہلِ جنت تھک نہ جائیں گے؟

سوال جناب عالی! اہلِ جنت ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور انھیں موت نہیں آئے گی۔ ایک انسان کو لاکھوں نعمات میسر ہوں تو آخرکار ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب انسان ان نعمات سے تھک جاتا ہے۔ کیا اہلِ جنت ابدی زندگی سے اُکتا نہ جائیں گے؟

جواب انسان کسی بھی نعمت سے اس وقت اُکتاتا ہے جب نعمت ایک ہی شکل میں ہو، مثلاً بنی اسرائیل کو من وسلویٰ نامی دو غذائیں ملی تھیں۔ آخرکار وہ انھیں استعمال کرتے کرتے تھک گئے تھے اور انھوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے اس میں تبدیلی لائیں...... جنت کی نعمات میں یکسانیت نہیں ہوگی کہ انسان ان سے تھک جائیں۔ ہر لحظہ جدید سے جدید تر نعمت کا قدرت کی طرف سے فیضان ہوگا۔ اسی لیے تھکنے اور اُکتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کیا توبہ کی کچھ شرائط بھی ہیں؟

سوال جناب عالی! کیا توبہ کی کچھ شرائط بھی ہیں؟

جواب جی ہاں، توبہ جہاں گناہوں کو مٹا دیتی ہے تو وہاں اس کے کچھ لوازم اور شرائط بھی ہیں۔

اگر انسان نے ایسا گناہ کیا جہاں کفارہ کی ضرورت تھی تو توبہ کرتے وقت اس کا کفارہ ادا کرے۔ اگر ترکِ واجب کیا ہے تو پھر توبہ کے ساتھ واجب کی قضا کو بجا

لائے۔ اگر ایسا فعل کیا جہاں تصحیح کی ضرورت تھی تو توبہ کے ساتھ تصحیح بھی کرے۔ اگر ایسا فعل سرانجام دیا جہاں قصاص واجب ہوتا ہے تو اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کر کے توبہ بھی کرے۔

اور اگر ایسا فعل سرانجام دیا جہاں حدِ شرعی نافذ ہوتی ہو تو اس وقت توبہ بھی کرے اور اپنے آپ کو حدِ شرعی کے لیے پیش کرے۔

بعض اوقات صاحبِ حق کے معاف کرنے سے بھی انسان عذابِ الٰہی کی پکڑ سے محفوظ ہو جاتا ہے مثلاً اگر صاحبِ مال مقروض کو اپنا قرض معاف کر دے تو انسان کو توبہ کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔

صفاتِ زائدہ کی نفی کی دلیل

سوال جناب عالی! نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں یہ الفاظ موجود ہیں:

......وكمال الاخلاص نفي الصفات عنه لشهادة كل صفة انها غير الموصوف وشهادة كل موصوف انه غير الصفة...... "خدا کے لیے کمالِ اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے کیونکہ ہر صفت یہ گواہی دیتی ہے کہ وہ موصوف سے جداگانہ ہے اور ہر موصوف اس بات کا گواہ ہے کہ وہ صفت سے علیحدہ ہے"۔

ہم اس مفہوم کو کیسے سمجھیں جب کہ ہمارے علماء کا یہ عقیدہ ہے کہ صفات عین ذات ہیں؟

جواب علمائے شیعہ اگر صفات کو عین ذات مانتے ہیں اور زائد بر ذات نہیں مانتے تو ان کے اس عقیدہ کی بنیاد امیر المومنین علیہ السلام کے اسی فرمان پر ہی قائم

ہے۔ آپ نے اس فرمان میں یہ واضح کیا کہ صفاتِ الٰہی کو زائد بر ذات ماننا صحیح نہیں ہے کیونکہ صفات زائد موصوف سے جدا ہوتی ہیں اور وہ اپنے قیام وتحقق کے لیے موصوف کی محتاج ہوتی ہیں جب کہ اللہ اس سے مستغنی ہے۔ اور جب دو متغایر اشیاء ہوں گی تو کبھی وہ مابہ الامتیاز ہوں گی اور کبھی وہ مابہ الاشتراک ہوں گی۔

مابہ الاشتراک چیز کبھی مابہ الامتیاز نہیں ہوتی ورنہ واحد کثیر بن جائے گا اور کثیر واحد بن جائے گا۔ دو متغائر اشیاء دو اجزا سے مرکب ہوں گی۔ ایک ذریعہ امتیاز ہوگی اور دوسری ذریعہ اشتراک ہوگی۔ اور اس سے ذاتِ الٰہی میں ترکیب لازم آئے گی۔ ترکیب کے بہت سے نقصان ہیں۔ ترکیب کے لیے احتیاج لازم ہے اور اس سے تعدد قدماء لازم آتا ہے۔

اسی لیے امیر المومنین علیہ السلام نے مذکورہ کلمات کے فوراً بعد ارشاد فرمایا:

فمن وصف اللّٰہ سبحانہ فقد قرنہ ومن قرنہ فقد ثناہ ومن ثناہ فقد جزاہ......

''یعنی جس نے صفت زائدہ سے اللہ کی توصیف کی تو اس نے ذاتِ خداوندی کو صفتِ زائدہ سے ملا دیا اور جس نے اسے صفت زائدہ سے ملایا وہ دوئی کا قائل ہوا، اور جس نے دوئی کو اپنایا تو وہ اجزا کا قائل ہوا''۔

الغرض اس خطبہ سے امیر المومنین علی علیہ السلام نے صفاتِ زائدہ کی نفی کی ہے اور متکلمین شیعہ کا بھی یہی نظریہ ہے۔

بداء کی حقیقت اور اس کی اہمیت

سوال الکافی کے باب البداء میں کسی معصوم سے یہ الفاظ منقول ہیں:

ماعبد اللّٰه بشیٔ مثل البداء

ایک اور روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں:

ما عظم اللّٰه بمثل البداء

مذکورہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت الٰہی اور تعظیم الٰہی کے لیے بداء کے عقیدہ کی بڑی اہمیت ہے۔ آخر عقیدہ بداء میں ایسی کون سی صفات پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اسے اتنی اہمیت دی گئی ہے؟ جب کہ برادرانِ اہلِ سنت ہم پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ شیعہ اس عقیدہ کو مانتے ہیں اور اس سے خدا کی جہالت ثابت ہوتی ہے (نعوذ باللہ) التماس ہے کہ اس مسئلہ پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔

جواب مذکورہ بالا دونوں روایات الکافی کے علاوہ توحید شیخ صدوق کے صفحہ ۳۳۲-۳۳۳ پر بھی مرقوم ہیں۔ آیئے پہلے یہ سمجھیں کہ جب خداوند عالم کے لیے لفظ "بداء" استعمال ہوتا ہے تو ہمارے ہاں اس کا کیا مفہوم ہوتا ہے؟

بداء یہ ہے کہ خلق، رزق، امانت واحیاء کے متعلق ایسی خبر دی جائے جس کی حکمت متقاضی ہو لیکن یہ نہ بتایا جائے کہ اس میں ترمیم و تنسیخ بھی ممکن ہے۔

مثلاً حضرت یونس علیہ السلام کو بتایا گیا تھا کہ ان کی قوم پر عذاب نازل ہوگا لیکن انھیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اگر انھوں نے اجتماعی توبہ کرلی تو عذاب ہٹالیا جائے گا۔

اس مسئلہ کو یوں سمجھیں کہ خدا کے ہاں دو طرح کی الواح پائی جاتی ہیں۔ ایک لوح وہ ہے جسے لوح محو واثبات کہتے ہیں اور دوسری لوح وہ ہے جسے لوح محفوظ اور ام الکتاب کہا جاتا ہے۔

لوح محو واثبات میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے مثلاً خدا اپنے کسی نبی کو یہ خبر دیتا

ہے کہ فلاں شخص ستر سال تک زندہ رہے گا لیکن وہ نبی کو یہ نہیں بتاتا کہ اگر اس نے صلہ رحمی کی تو اس کی عمر میں تیس برس کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح سے یہ نہیں بتایا جاتا کہ اگر اس نے قطع رحمی کی تو اس کی عمر سے تیس برس کاٹ دیئے جائیں گے۔

"بداء" کا تعلق لوح محو و اثبات سے ہوتا ہے۔ اس سے خدا کی جہالت لازم نہیں آتی کیونکہ اس کے پاس اُم الکتاب موجود ہے، جس میں اس کے اَنمٹ اور ازلی فیصلے لکھے ہوئے ہیں۔

بداء کا اوّل و آخر مقصد یہ ہے کہ اللہ اپنے افعال میں آزاد ہے، وہ پابند نہیں ہے۔ وہ تغیّر و تبدل پر قدرت رکھتا ہے، مثلاً پہلے قبلہ بیت المقدس کی طرف تھا۔ حضور اکرمؐ کی خواہش کے تحت خدا نے اسے تبدیل کر دیا اور خانہ کعبہ کو قبلہ کا درجہ دے دیا۔

اس کے برعکس یہودیوں کا یہ نظریہ تھا: يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (المائدہ:۶۴) "اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں"۔

اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ بس جو فیصلے ہونے تھے وہ ہو گئے۔ اب خدا پابند ہو چکا ہے وہ کوئی نیا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

اگر اس نظریہ کو مان لیا جائے تو پھر انسان نہ تو کسی مریض کی شفایابی کی دعا مانگ سکتا ہے اور نہ ہی رزق کے اضافہ کی دعا مانگ سکتا ہے اور نہ ہی کسی مصیبت کے دُور کرنے کی دعا مانگ سکتا ہے۔

اس کے برعکس جس شخص کا عقیدہ بداء پر ہوگا وہ دعا سے مایوس نہ ہوگا اور وہ خدا سے ہر وقت ملتمس دعا رہے گا اور اسے یقین ہوگا کہ جس نے تقدیر بنائی ہے وہ اسے بدل بھی سکتا ہے۔

علامہ مجلسی فرماتے ہیں: عقیدہ بداء کے تین فوائد ہیں:

① اس سے اللہ تعالیٰ کاتبین لوح فرشتوں کو یہ دکھاتا ہے کہ وہ دیکھ لیں کہ اللہ

اپنے بندوں پر کتنا مہربان ہے۔ اس سے ملائکہ کی معرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲ اس سے اللہ اپنے بندوں کو اپنے انبیاء ورسل کی زبانی یہ پیغام پہنچاتا ہے کہ ان کی تقدیر سازی میں ان کے اچھے اور بُرے اعمال کا بڑا دخل ہے۔ اس سے انسانوں کو نیک کام کرنے کی ترغیب ملتی ہے اور برائیوں سے بچنے کی تشویق پیدا ہوتی ہے۔

۳ جب کبھی انبیاء ورسل لوح محو واثبات سے کسی خبر کو نقل کرتے ہیں اور پھر خدا اس میں ترمیم کر دیتا ہے تو اس کے باوجود جو لوگ انبیاء ومرسلین کی صداقت کے عقیدہ پر قائم رہتے ہیں اللہ انھیں کئی گنا زیادہ اجر عطا کرتا ہے۔ (سفینۃ البحار، مادہ ''البداء'')

جب کوئی عقیدہ بداء نہیں رکھتا تو اسے ہر قدم پر مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مثلاً بیمار ہو تو یہ سمجھتا ہے کہ میری تقدیر میں بیماری لکھ دی گئی ہے۔ اب میرا دعا مانگنا بے اثر ہے۔ اسی طرح سے وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو دعا پر عقیدہ نہیں رکھتا۔ الغرض ایسا شخص دعا کے ثمرات اور افادیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

کیا شیعوں کو گناہانِ کبیرہ کرنے کی اجازت ہے؟

سوال جناب عالی! بندہ ایک واعظ ہے اور محافل ومجالس میں وعظ ونصیحت کرتا رہتا ہے۔ ایک مجلس میں بندہ نے والدین کی نافرمانی کے خطرات کو واضح کیا اور قرآن وسنت سے اطاعت والدین کی اہمیت کو پیش کیا۔

مجلس کے اختتام پر ایک شخص نے کہا کہ آئندہ میں اپنے والدین کی نافرمانی کروں گا مگر اس کے باوجود دوزخ میں بھی نہیں جاؤں گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں شیعہ ہوں۔

اب آپ سے التماس ہے کہ اس طرح کے لوگوں کو کیسے مطمئن کیا جائے؟

جواب ایسے شخص کو شفاعتِ اہلِ بیتؑ کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے یہ سمجھ لیا ہے کہ آلِ محمدؐ ہر شیعہ کی شفاعت ضرور کریں گے۔ جب کہ حسب ذیل حقائق پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

① ہادیانِ دین سے بیسیوں ایسی احادیث منقول ہیں جس میں انھوں نے اپنے شیعوں کے اوصاف بیان فرمائے۔ چنانچہ شیخ صدوق نے اس عنوان پر پورا رسالہ لکھا ہے جس کا نام "صفات الشیعہ" ہے۔

علامہ مجلسی نے بحارالانوار، جلد ۶۵ میں "صفاتِ شیعہ" کے عنوان سے پورا باب قائم کیا ہے جو کہ پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ جو شخص عاق والدین کی احادیث سن کر یہ کہے کہ اب میں والدین کی نافرمانی کروں گا اور اس کے باوجود میں دوزخ سے بچ جاؤں گا کیونکہ میں شیعہ ہوں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا شخص شیعہ کہلانے کا حق دار ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی شفاعت اسے ملے گی جو اپنے گناہ کو گناہ سمجھتا ہو اور گناہ کے ذریعہ سے عزتِ خداوندی کو چیلنج نہ کرتا ہو اور خدا کے حضور استکبار نہ کرتا ہو۔ اگر کوئی شخص نفسِ امارہ کے ہاتھوں پر مجبور ہو کر گناہانِ کبیرہ کرے بشرطیکہ تمرد و طغیان اس کے پیشِ نظر نہ ہو۔

یاد رکھیں گناہ گار کے لیے بخشش ہے لیکن باغی کے لیے کوئی بخشش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معصومینؑ نے فرمایا:

لا تنال شفاعتنا مستخفا بالصلاة

"جو نماز کو حقیر جانتا ہو، اسے ہماری شفاعت نصیب نہ ہوگی"۔

حضرت امام سجاد علیہ السلام نے دعائے ابو حمزہ ثمالی میں یہ کلمات کہے:

الهی لم اعصك حين عصيتك وانا بربوبيتك جاحد ولا بامرك مستخف ولا لعقوبتك متعرض ولا

بوعيدك متهاون ولكن خطيئة عرضت وسولت لی
نفسی وغلبنی هوای واعاننی علیها شقوتی وغرنی
سترك المرخي علیّ

"میرے معبود! جب میں نے تیری نافرمانی کی تو اس وقت میں نہ تو تیری ربوبیت کا منکر تھا اور نہ ہی تیرے فرمان کو خفیف جانتا تھا اور نہ ہی تیرے عذاب کو دعوت دینے کی غرض سے میں نے ایسا کیا اور نہ ہی تیرے وعید کو ہلکا سمجھتا تھا۔ بس ایک خطا تھی جو سرزد ہوگئی اور میرے نفس نے گناہ کو مزین کر کے مجھے دکھایا اور میری خواہش مجھ پر غالب آئی تھی اور اس کے لیے میری بدبختی نے مجھ سے معاونت کی اور تو نے مجھ پر ستاریت کا جو پردہ ڈال رکھا ہے اس سے مجھے دھوکا ہوا تھا"۔

میں جواب کو مختصر کرتے ہوئے یہ کہتا ہوں:

۱۔ اگر مذکورہ شخص اہل بیت طاہرینؑ کی روایات کو اس طرح سے ٹھکراتا ہے تو یہ شخص اللہ کے فرمان کو ٹھکرانے والے کی مانند ہے اور ایسے شخص کو ہم شیعہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ فرمانِ اہل بیتؑ کو ٹھکرانے والا ان کا شیعہ نہیں کہلا سکتا۔

۲۔ اگر بالفرض ایسے شخص کو شیعہ سمجھ بھی لیا جائے تو ایسا شخص شرائطِ شفاعت سے محروم ہے، لہٰذا وہ مستحق شفاعت نہیں ہوسکتا۔ شفاعت کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ گناہ گار سرکش نہ ہو اور خدا اور رسول کا مقابلہ کرنے والا نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیْهَا (التوبہ:۶۳)

"کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ

کرتا ہے تو اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا"۔

④ اوصافِ شیعہ کا دیکھنا ضروری ہے۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ روایات اہل بیتؑ کو آئینہ بنا کر اس میں اپنی شکل وصورت کا جائزہ لے۔

تمت بالخیر والحمد للّٰہ رب العالمین